گلشن ہند

مشہور شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ

جس کو

میرزا علی متخلص بہ لطف

نے، بعہد مارکوئس آوف ویلزلی گورنر جنرل ہند، اُردو کے مشہور سرپرست مسٹر جان گلگرسٹ کی
فرمائش سے، علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرہ گلزار ابراہیم سے، مع اضافوں کے اُردو زبان بہ
جو آج سے ایک سو پانچ برس پیشتر کی سادہ اُردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ

سنہ ۱۸۰۱ء

میں تصنیف کیا، اور

سنہ ۱۹۰۶ء

میں

شمس العلما مولوی شبلی کی تصحیح و تحشیہ اور مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے
کے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ، اُردو زبان کی خدمت کے لئے

عبداللہ خاں نے حیدر آباد دکن سے شائع کیا

اور

دار الاشاعت پنجاب

کے

رفاہ عام سٹیم پریس لاہور میں چھپا

ڈیڈی کیشن

ہز ایکسلنسی مہاراجہ یمین السلطنۃ
بہادر وزیراعظم دولت آصفیّہ کو چوں کہ
اُردو زبان سے ایک خاص دلچسپی
ہے، اور آپ خود بھی اُردو زبان کے
ایک ممتاز مصنّف اور بلند پایہ شاعر
ہیں، لہذا یہ کتاب جناب کے نام
نامی پر ڈیڈیکیٹ کی جاتی ہے
گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

خاکسار
عبداللہ خاں حیدر آباد دکن

فہرست تذکرہ گلشن ہند

پبلشر کی التماس

۱۳۲۶ ہجری کے موسم برسات میں پائے تخت حیدرآباد کی مشہور ندی میں، جو ہمارے شہر کے نیچے بہتی چلی گئی ہے، ایک عظیم الشان سیلاب آیا۔ اس سیلاب سے لاکھوں روپے کا نقصان ہوا، اور کچھ لوگوں کو بہ مصداق "چوں خراب شود خانۂ خدا گردد" فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن اس طوفان کی سب سے بڑی اور مفید یادگار یہ تذکرہ ہے، جو پبلک میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر سیلاب نہ آتا تو اس منجمد زمین سے اس علمی چشمے کا بہنا ممکن نہ تھا۔ یہ سیلاب جہاں اور ہزاروں چیزوں کو اپنے ساتھ لایا، وہاں کسی آفت زدہ کا ایک کتب خانہ بھی بہا لایا، اور اُس میں یہ تذکرہ بھی تھا۔ پبلک میں یہ آب آوردہ کتابیں کوڑیوں کے داموں بکیں، اور یہ تذکرہ ہمارے کرم فرما، مولوی غلام محمد صاحب، مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ کے ہاتھ لگا، انہوں نے علامہ شبلی کو دکھایا۔ علامہ موصوف نے اس کو بدرجہ غایت پسند کیا، اور انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کرنے کا قصد کیا، لیکن انجمن اپنی پیچ در پیچ طرز عمل کی وجہ سے اس کو نہ چھاپ سکی۔ اور علامہ موصوف نے ہم کو اُس کے شائع کرنے کی رائے دی، اور خود اُس کے اِڈِٹ کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ علامہ موصوف نے اس کی تصحیح بھی کی، اور اُس پر کچھ نوٹ بھی لگائے، جو بجنسہ چھاپ دیئے گئے ہیں۔

اس تذکرے کی معنوی خوبیاں، اور تاریخی حیثیت سے اُس کی اہمیت، اُس مقدمے سے ظاہر ہوگی جو ہمارے کرم فرما مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے، پرنسپل مدرسہ آصفیہ حیدرآباد نے ہماری فرمایش سے اس تذکرے پر لکھا ہے جس میں اُنہوں نے اُردو زبان کی نشو و نما کی تاریخ اور اُس کی قدیم تصانیف کا بیان اور تذکرہ ہذا کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کو ریویو لکھنے میں جو خاص ملکہ ہے، اُس کو تمام اُردو داں پبلک جانتی ہے، کہ وہ کس خوبی سے اس اہم کام کو انجام دیتے ہیں، اس لئے ہم بجز شکریئے کے اَور زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

ہمیں مولوی غلام محمد صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے، جنہوں نے اپنی علمی فیاضی سے، یہ کتاب ہم کو چھاپنے کے لئے دی اور کئی سال تک ہمارے پاس رہی - علامہ شبلی بھی خاص شکریے کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اپنی عنایت سے اُس کی تصحیح، اور تحشی میں اپنا وقت صرف کیا +

اس کتاب کے چھپوانے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے، اور حتیّ الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی چھوٹنے نہ پائے + البتہ صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ میر، سودا، درد اور مصنف کا نمونۂ کلام، جو اس تذکرے میں نہایت کثرت کے ساتھ درج تھا، اس میں سے صرف عمدہ نمونہ چن لیا گیا ہے، اور اس خدمت کو بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ذوق سلیم نے انجام دیا ہے - اس کے سوا اس میں اَور کوئی تصرف نہیں کیا گیا بلکہ مقدمے اور نوٹوں سے اُس کو اَور زیادہ مخزن معلومات بنایا گیا ہے - جس کی قدردانی کی پبلک سے اُمید کی جاتی ہے - اگر پبلک نے اس کی قدردانی کی تو ہم بہت جلد اَور مفید علمی کتابوں کے شائع کرنے کے قابل ہوسکیں گے جو انگریزی اور عربی سے ترجمہ کی گئی ہیں +

عبداللہ خاں

کتب خانہ آصفیہ
حیدرآباد دکن
۱۶ نومبر ۱۹۰۶ء

مقدمہ

بر تذکرۂ گلشنِ ہند

(از مولوی عبدالحق صاحب بی ۔ اے ۔ پرنسپل مدرسہ آصفیہ ۔ حیدر آباد دکن ۔)

یہ کتاب شعرائے اُردو کا قابل قدر و نایاب تذکرہ ہے اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت[1] شخص کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیہ کیا، اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمایش کی ۔ میں خود بے بضاعت، تاہم اس فرمایش کو جو اُنہوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا، اور بسر و چشم قبول کیا ✦

حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ کے عہد، اور امیر الممالک لارڈ وارن ہیسٹنگز، گورنر جنرل کے زمانے میں، علی ابراہیم خاں[2] نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی

---

[1] مولوی عبداللہ خان صاحب کتبخانہ آصفیہ حیدر آباد دکن ۔

[2] علی ابراہیم خاں، متخلص بہ علی، مشہور ادیب اور مورخ ہیں ۔ پٹنہ کے رہنے والے تھے، اور بعہد گورنر جنرل لارڈ کارنوالس، بنارس میں چیف مجسٹریٹ اور بعد ازاں گورنر رہے، اور ۱۲۰۸ ہجری میں وہیں انتقال کیا ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں ۔

(۱) گلزار ابراہیم، تذکرۂ شعرائے اُردو، جو شاہ عالم کی بادشاہت، آصف الدولہ کی وزارت، اور وارن ہیسٹنگز کی گورنر جنرلی میں، ۱۱۹۸ھ (۱۷۸۴ء) میں لکھا ہے، اور جس پر میرزا علی لطف نے اپنے اس تذکرہ گلشن ہند کی بنیاد رکھی ✦

(۲) خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم، یہ دونوں فارسی شعرا کے تذکرے ہیں ✦

(۳) وقائع جنگ مرہٹہ، یہ کتاب بعہد لارڈ کارنوالس ۱۲۰۱ ہجری میں لکھی گئی ۔ اس میں ۱۱۷۱ھ سے ۱۱۹۹ھ تک کے حالات درج ہیں ۔ میجر فلر نے انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے ۔ اس میں بڑی خوبی سے مرہٹوں کے حالات لکھے گئے ہیں ۔ اور پانی پت کی جنگ کا حال ایک ایسے شخص سے لے کر لکھا گیا ہے جس نے اپنی آنکھوں یہ جنگ دیکھی تھی ✦

(۴) ایک کتاب میں راجہ چیت سنگھ والی بنارس کے بغاوت کے حالات لکھے ہیں ۔ یہ واقعہ خود مصنف کے زمانے کا ہے، مگر چونکہ اس کتاب کے شروع ہی میں یہ فقرہ لکھا ہے کہ "من کہ علی ابراہیم خاں یکے از خیر خواہان کمپنی انگریزم" لہٰذا کسی قدر بدگمانی ہوتی ہے ✦

(۵) خطوط، جو برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہیں، اور جس سے اس زمانے کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے ✦

میں لکھا تھا، اور اس کا نام گلزار ابراہیم رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں ۱۱۹۸ھ ہجری مطابق ۱۷۸۴ء عیسوی میں جاکر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اُردو کے بڑے قدردان اور محسن، مسٹر گلکرسٹ کی نظر سے گزرا۔ انہوں نے مؤلف تذکرۂ ہذا سے فرمایش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اُردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ اُن کا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں، اور اُن میں اُردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اس طرح یہ کتاب اُردو میں لکھی گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ نرا ترجمہ ہے، بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے، حالات میں بھی اور کلام میں بھی، جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہے ۔

یہ تالیف اُس زمانے میں ہوئی جب کہ دلّی میں شاہ عالم بادشاہ اور لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں رونق بخش مسند حکومت تھے۔ بادشاہ تو ایک بےبسی اور بےکسی کی حالت میں تھے، اور نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، البتہ پورب کی طرف سے ایک جھلکی دکھائی دی۔ دلّی کے اہل کمال اپنے وطن سے مُنہ موڑ اُسی طرف ہو لئے۔ یہ قدردانی کے بھوکے تھے، قدر ہوتے جو دیکھی تو وہیں کے ہو رہے۔ سب سے زیادہ شاعری کا ہنگامہ گرم تھا۔ بچّہ بچّہ شاعری کا دم بھرتا تھا۔ ادھر کے اساتذہ جو پہنچے تو اُنھوں نے وہ رنگ جمایا کہ سب رنگ پھیکے پڑ گئے۔ یہاں تک کہ نواب سعادت علی خاں جیسا عالی دماغ، متین، منتظم، اور کام کرنے والا شخص بھی اس کے اثر سے نہ بچا۔ باوجود اس کے انشاءاللہ خاں نے جو ہزار پھکڑوں کا ایک پھکڑ تھا، آخر انہیں اپنی گوں نہ دیکھ کر کہہ ہی دیا :-

"میں ہوں ہنسوڑا اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں"

کہتے ہیں کہ یہ اُردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بیشک، لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جس کے ایک رخ پر عروج اور دوسرے رُخ پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی۔ عروج تو اس لئے کہ زبان روز بروز منجھتی جاتی تھی اور صاف اور شستہ ہوتی جاتی تھی، اور زوال اس لئے کہ فن شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص۔ اس کے بعد اَور لوگ جو پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہو لئے۔ شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہے، قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا،

ایک آدھ محاورہ آگیا، کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی، کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہوگیا، رہا مضمون، سو خدا کے فضل سے اس میں برکت ہی برکت تھی، اور اب بھی وہی حال ہے مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقررہ ہیں، اور اب تک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں کسی نئی تشبیہ کا لکھنا بڑی بہادری اور جرأت کا کام ہے، کیوں کہ ہمارے نکتہ سنج شاعر اس کے لئے سند طلب کرتے ہیں۔ جیسے کوئی قانون داں کسی فوجداری جرم میں تعزیرات ہند کی دفعہ تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان شعراء کی محنت سے زبان صاف ہوگئی، لیکن اپنی شاعری کی طرح ٹھٹھر کے رہ گئی، اور جو حصار کہ ہمارے نغز گو شعرا نے اس کے گرد باندھ دیا تھا اس سے آگے قدم نہ رکھ سکی۔ اس سے بڑھ کر محدود ہونے کی اَور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ شاعری کا دعویٰ ہے، اردو کے اُستاد ہیں۔ مگر خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں، دیوان اُردو ہے، مگر مقدمہ فارسی میں لکھا ہے۔ کوئی معاملہ آپڑا اظہار مطلب فارسی میں ہوتا ہے اُردو میں نہیں، کسی طبیب کے پاس جایئے نسخہ فارسی میں ہے (اور یہ اب تک رائج ہے)، سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہے، یہاں تک کہ خط کی مشق کے لئے بھی شعر لکھے جاتے ہیں تو فارسی، اب اُردو کو وسعت ہو تو کیوں کر؟

لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی، اور جس کا تسلط اس وقت ہندوستان پر اس طرح بڑھتا چلا جاتا تھا، جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے، اس نے اُردو کی دستگیری کی۔ اور وہ اس لئے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لئے اس کا جاننا ضروری تھا۔ دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی، جہاں جہاں اس وقت بھی مغلیہ حکومت کے آثار تھے، اسی کا دور دورہ تھا۔ علاوہ اس کے ہندوستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی۔ اس لئے انہوں نے اس کی سرپرستی کی۔ سب سے بڑا احسان ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا ہے جس نے انیسویں صدی کے شروع میں، بمقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قایم کیا، جس کا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں، ان کی

تعلیم کے لئے اُردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں۔ اور غالبًا اسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اُردو زبان دفتر کی زبان قرار پائی۔ یہ عجب واقعہ ہے، اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی، ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل کی کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی، اور دوسرے دور میں اُردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی۔ اس شخص نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے۔ اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو نثر کا لکھنا اسی وقت سے شروع ہوا، اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ جو احسان وَلی نے اُردو نظم پر کیا تھا، اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گلگرسٹ نے اُردو نثر پر کیا ہے +

چوں کہ یہ تذکرہ بھی اسی نامور اور قابل شخص کی تحریک سے لکھا گیا تھا، لہٰذا اس مقام پر مختصراً یہ بیان کرنا کہ اس کی نگرانی میں، یا اَور انگریزوں کی سعی سے کیا کیا کام ہوا، اور اُردو زبان میں کس قدر اضافہ ہوا، نامناسب نہ ہوگا +

اس سلسلے میں سب سے اول سید محمد حید بخش حیدری قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ۱۸۰۱ عیسوی میں توتا کہانی لکھی، جو اصل میں انہوں نے طوطی نامہ کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانے میں، دکنی زبان میں لکھا تھا، مگر ماخذ اس کا ایک سنسکرت کتاب ہے۔ آرایش محفل یعنی مشہور قصۂ حاتم بھی جواب تک عوام میں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے، انہیں کا لکھا ہوا ہے۔ ایک کتاب گل مغفرت یا وہ مجلس مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں بھی لکھی ہے۔ فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا بھی اُردو ترجمہ کیا ہے جس کا نام گلزار دانش ہے۔ ایک اَور کتاب تاریخ نادری اُردو میں لکھی، یہ کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے +

دوسرے صاحب میر بہادر علی حسینی ہیں انہوں نے میر حسن دہلوی کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان (قصہ بدر منیر و بے نظیر) کو اُردو نثر میں کیا ہے اور اس کا نام نثر بے نظیر رکھا ہے۔ اور ایک اَور کتاب اخلاق ہندی کے نام سے لکھی ہے، اس کتاب کا ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب

ہے جو اصل میں سنسکرت سے لی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی تھیں ۔

میر امّن دہلوی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ احمد شاہ دُرّانی کے زمانے میں جو دلّی پر آفت آئی تو یہ وطن کو چھوڑ کر پٹنہ میں آرہے، یہاں سے ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے۔ باغ و بہار کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ کتاب ۱۸۰۱-۲ء میں لکھی گئی ہے۔ اور اُنیسویں صدی کے آغاز میں دلّی کی جو زبان تھی اُس کا اعلےٰ نمونہ ہے۔ اس کتاب کا ماخذ امیر خسرو کی چہار درویش ہے میر امّن نے امیر خسرو کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا، بلکہ اس سے پیشتر ایک صاحب تحسین نامی ساکن اٹاوہ نے اسے امیر خسرو کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا، اور اس کا نام نوطرز مرصع رکھا تھا۔ میر امّن نے اخلاق محسنی کے تتبع میں ایک کتاب گنج خوبی بھی اسی زمانے میں لکھی۔ حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر تھے، ۱۸۰۳ء میں انہوں نے علامی ابوالفضل کی کتاب عیار دانش کا ترجمہ اُردو میں کیا، اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے، اور عربی میں کلیلہ و منہ کے نام سے مشہور ہے ۔

میر شیر علی افسوس بھی اسی سلسلے میں ممتاز شخص ہیں۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ گیارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ بہت سے انقلابات کے بعد نواب سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے نوازش علی خاں کے ہاں ملازم رہے، اور جب یہ شیرازہ بکھر گیا تو صاحب عالم و عالمیان مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے متوسل ہو گئے۔ مگر جب شہزادہ عالم کا کوچ شاہ جہان آباد کی طرف ہوا تو یہ ساتھ نہ جا سکے۔ اور نواب سرفراز الدولہ بہادر کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔ تلمذ اُن کو میر حیدر علی حیران سے ہے، اور بعض کا قول ہے کہ میر درد اور میر سوز کے شاگرد ہیں۔ اتنے میں صاحب عالی شان، بارلو صاحب نے، مسٹر گلگرسٹ کے مشورے سے، زباں دانانِ ریختہ کو لکھنؤ سے طلب فرمایا، چناں چہ لکھنؤ کے رزیڈنٹ مسٹر اسکاٹ نے میر شیر علی افسوس کو انتخاب کیا، اور دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کر کے پانسو روپے خرچ راہ دیا، اور کلکتہ روانہ کیا۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے، اور نو برس بعد انتقال کر گئے۔ یہاں انہوں نے

ایک قابل قدر کتاب آرایش محفل لکھی، جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں۔ اس کتاب کا ماخذ سجان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے، اور مرنے سے سال بھر پہلے یعنی ۱۸۰۸ء میں سعدی کی گلستاں کا ترجمہ باغ اُردو کے نام سے اُردو میں کیا +

نہال چند نے ۱۸۰۳ء میں مثنوی گل بکاولی کو اُردو نثر میں لکھا، اور نام اس کا مذہب عشق رکھا +

کاظم علی جوان بھی دہلی کے تھے، بعد ازاں لکھنؤ میں آئے، اور وہاں سے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں آئے۔ انہوں نے ۱۸۰۲ء میں شکنتلا کا قصہ اُردو میں لکھا۔ نواز کبیشر نے جو برج بھاکا میں (۱۷۱۶ء) شکنتلا کی کہانی لکھی تھی، اس کا یہ ترجمہ ہے۔ انہوں نے ایک بارہ ماسہ بھی لکھا ہے، اور اس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے، جس کا نام دستور ہند ہے، اور جو ۱۸۱۲ء میں چھپا +

اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالے کا ترجمہ عربی سے اُردو میں کیا، جس میں شاہ اجنہ کے سامنے انسان و حیوان کا جھگڑا پیش ہے، کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے۔ یہ منجملہ ان رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی اخوان الصفا کے اہتمام سے لکھے گئے تھے +

سری لالو گجرات کا برہمن تھا، جو شمالی ہند میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ اس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں، مثلاً، پریم ساگر، راج نیتی، و لطایف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں۔ سنگھاسن بتیسی، سری لالو اور جوان نے مل کر ۱۸۰۱ء میں لکھی، جو آدھی اُردو آدھی ہندی ہے +

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی، جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مثل ہے! اور نیز ولا کی مدد سے قصہ مادھونال کو برج بھاکا سے اُردو میں ترجمہ کیا +

علاوہ اس کے خود گلکرسٹ نے ۱۸۰۱ء میں اُردو کی ایک لغت لکھی، زبان کے بعض قواعد اور رایسے اور مختلف طرح سے اُردو زبان کی خدمت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ سے اول بھی

ایک شخص فرگسن نامی نے اُردو کی ایک لغت لکھی تھی، جو لندن میں ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی۔ مگر چونکہ وہ بالکل ناکافی تھی، جنرل ولیم کرک پیاٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا، جس کے انہوں نے تین حصے کئے، مگر اس کا ایک ہی حصہ طبع ہونے پایا۔ اس حصے میں انہوں نے وہ الفاظ لئے ہیں جو عربی فارسی سے ہندی میں آ گئے ہیں۔ باقی دو حصوں کے طبع کرنے کے لئے انہیں ناگری ٹائپ کا انتظار تھا، وہ جلد تیار نہ ہو سکا، اور کتاب ناقص رہ گئی۔ یہ ایک حصہ لندن میں ۱۷۸۵ء میں طبع ہوا۔ لندن سے جب یہ واپس آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر گلگرسٹ بھی اسی کام میں لگے ہوئے ہیں، تو چاہا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں، مگر چوں کہ ان کو اَور بہت سے کام کرنے تھے، اس لئے تھوڑے دنوں کے بعد وہ الگ ہو گئے، اور ڈاکٹر گلگرسٹ تنہا یہ کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ انگریزی ہندوستانی لغت کا تیار کر کے ۱۷۹۰ء میں چھاپ دیا، مگر دوسری جلد ہندوستانی انگریزی لغت ختم نہ کر سکے۔ علاوہ اُن تمام دِقّتوں کے جن سے وہ گھبرا گئے تھے، ایک دِقّت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے۔ صرف ۸۰ صاحبوں نے خریداری منظور کی۔ حالاں کہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپیہ کا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت حسرت کے ساتھ خیرباد کہا۔ اس کے بعد میجر ڈیوڈ تامسن رچرڈسن سپرنٹنڈنٹ و کمانڈنٹ ملٹری ایکاڈمی نے اُردو لغت لکھنی شروع کی، مگر افسوس کہ اس کا بھی وہی حشر ہوا، اور طبع ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کے بعد ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ٹیلر نے ایک ہندوستانی انگریزی لغت طبع کرائی۔ اسی کتاب کو پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے دیسی ادیبوں کی امداد سے نظر ثانی کر کے چھپوایا۔

گلیڈون نے ایک لغت فارسی اور ہندوستانی زبان کی دو جلدوں میں لکھی، جو کلکتہ میں ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ مسٹر جان شیکسپیر نے ایک اُردو لغت ۱۸۱۷ء میں طبع کرائی، یہ کتاب زیادہ تر ٹیلر کی لغت سے ماخوذ ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اسی کتاب کو دوسرے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ فوربس کی لغت ۱۸۴۷ء میں لندن میں چھپی۔ ایک فرانسیسی

برٹرینڈ نے بھی ایک لغت لکھی، جو پیرس میں ۱۸۵۸ء میں طبع ہوئی۔ برایس کی لغت سنہ ۱۸۶۴ء میں لندن میں چھپی۔ پلیٹ نے بھی ایک لغت لکھی ہے، جس کے طبع ہونے کا سن مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر فیلن نے اُردو کی کئی لغات لکھیں، ان کی ہندوستانی انگریزی لغت درحقیقت سب سے بہتر ہے، یہاں تک کہ اہل زبان نے بھی جو دو ایک لغت لکھے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر فیلن کا تتبع کیا گیا ہے، بلکہ اسی سے ماخوذ ہیں۔

اس مقدمے میں جو انگریزوں کے احسان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس تذکرے سے بھی بعض باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اس زبان سے خاص دلچسپی تھی، اور اس کی ترقی دینے میں انھوں نے حتی الامکان کوشش کی۔ میر شیر علی افسوس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے، اور وہ ہم نے اسی تذکرے سے لیا ہے۔ میر کے حال میں لکھا ہے:۔

"جن ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کی زباں دانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتہ سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب میر کی ہوئی، لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے، اور جوانانِ نومشق مربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں سے کبھی نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتہ میں شاعری کی جا درخواست حالی ہے"۔

غالباً اس جگہ کے لئے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا، کاش میر صاحب کا انتخاب ہوتا! چوں کہ ان کی نظم میں انتہا درجے کی فصاحت و شیرینی اور سلاست اور گھلاوٹ موجود ہے، اس لئے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جاکر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہل زبان ان کی نظم کی طرح اسے سر اور آنکھوں پر رکھتے، اور اُردو زبان میں ایک عجیب اور قابل قدر اضافہ ہوتا۔

نواب محبت خاں محبت، خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں، کے ذکر میں لکھا ہے کہ:۔

"انہوں نے نواب ممتاز یارالدولہ مسٹر جانسین کی فرمایش سے قصہ سسی پنوں کا اُردو میں نظم کیا، اور نام اس کا اسرارِ محبت رکھا"۔

میر قمرالدین کے حال میں درج ہے کہ:-

"انہوں نے میر محمد حسین - فرنگی لقب، کے توسل سے ممتاز الدولہ مسٹر جانسین کی سرکار میں توسل حاصل کیا، اور ان کی رفاقت میں کلکتہ آکر عمادالدولہ گورنر مسٹر ہشتین (ہیسٹنگز) جلادت جنگ بہادر کی اعانت سے پیشگاہ نظامت صوبہ بنگ سے ملک الشعرا کا خطاب لیا"۔

اس زمانے میں علاوہ ڈاکٹر فیلن کے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، کرنل ہال رائڈ سابق ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے بھی اُردو زبان کی ترقی میں بیش بہا مدد دی؛ سلسلہ تعلیم کے لئے عُمدہ عُمدہ کتابیں لکھوائیں، انگریزی سے بھی بعض چیزیں ترجمہ کرائیں، اور اس میں مفید اور نیک مشورہ دیا۔ کتابت اور چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا، اور اس میں کارآمد صلاحیں کیں۔ اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ لاہور میں ایک انجمن قایم کی جس میں نیچرل مضامین پر عُمدہ عمدہ نظمیں لکھوائیں۔ شمس العلما مولٰنا خواجہ الطاف حسین حالی، اور شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی بعض نظمیں انہیں کی تحریک سے لکھی گئیں اور وہیں پڑھی گئیں۔ کرنل ہالرائڈ کا یہ کام بہت قابل قدر اور قابل تعریف ہے، اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو نثر کی طرح اُردو نیچرل شاعری کی بنا بھی ایک حد تک انگریزوں ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ آج کل مسٹر بل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے جو انجمن ترقی اُردو کی صدارت قبول فرما کر اُردو کی سرپرستی فرمائی ہے وہ بھی کچھ کم قابل شکریہ نہیں۔ اسی سلسلے میں جو ایک اَور قابل قدر کام انگریزوں کے ہاتھوں ہوا ہے، اور جس کا ذکر میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ سب سے اول اُردو کتابیں بھی انہوں ہی نے چھپوائیں؛ اول اول فورٹ ولیم کالج ہی کے پریس میں اُردو کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں، اور جتنی کتابیں کہ ڈاکٹر گلگرسٹ، اور اس کے جانشینوں کی نگرانی اور مشورے سے تیار ہوتی تھیں وہیں چھپتی تھیں اس کے بعد لتھوگراف پریس سب سے پہلے دہلی میں ۱۸۳۷ء میں، استعمال ہوا؛

اور اس کے بعد سے روز بروز کتابوں کے چھپنے میں ترقی ہوتی رہی +

وہ انگریز حاکم، جس نے اُس ملک میں بیٹھ کر جو اُردو کا جنم بھوم اور وطن مالوفہ ہے، اُسے دفاتر سے نکال کر ذلیل کرنا چاہتا تھا، وہ سخت غلطی پر تھا۔ اگر وہ اس زبان کی تاریخ سے واقف ہوتا، اور یہ جانتا کہ اس کے واجب التعظیم بزرگوں نے اس کے حاصل کرنے اور اسے وسعت دینے میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلی ہیں، اور اس عجیب وغریب سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی اس عجیب و غریب زبان کی بنیاد بھی مستحکم کی ہے، تو ضرور اپنی حرکت پر نادم ہوتا۔ یہ زبان کسی خاص فرقے، یا کسی خاص ملت کی نہیں ہے، اس پر دنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہے، ہندو اس کی ماں ہیں، مسلمان اس کے باوا ہیں، اور انگریز اس کے گاڈ فادر ہیں۔ جو لوگ اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اُس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں، جو تینوں کے اتحاد کی یادگار ہے۔ وہ غلطی پر ہیں، جب تک ہندو اور مسلمان اور انگریز دنیا میں قائم ہیں، کم از کم اس وقت تک یہ زبان ضرور قایم رہے گی +

افسوس ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے حالات کچھ نہیں لکھے؛ دیباچے میں تو ذکر ہی نہیں، شعرا کے سلسلے میں جہاں اپنا حال لکھا ہے وہ بھی برائے نام ہے؛ بلکہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں بالکل کم اور ناکافی ہے، البتہ اپنا کلام بڑے شوق سے نقل کیا ہے، اور شاید اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سب کا سب درج تذکرہ کر دیا ہے۔ لہذا ہم نے کچھ ان کے کلام سے اور کچھ ادھر اُدھر سے تھوڑا بہت حال بہم پہنچایا ہے +

نام میرزا علی تخلص لطف تھا، ان کے والد کاظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے، ۱۱۵۲ھ ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہ جہان آباد تشریف لائے، اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا، فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا لطف دیباچے میں لکھتے ہیں +

"میرا ارادہ سیر حیدرآباد کا تھا مگر چوں کہ مسٹر گلگرسٹ نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھ سے اس

"تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی لہذا میں نے اسے بسر وچشم قبول کیا"۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ ہجری اور ۱۸۰۱ء کے ہیں، عہد سلطنت قایم ہے، اُسی بادشاہ روشن

دل خداپرست سے......"

پھر اس کے بعد نواب سعادت علی خاں بہادر کا ذکر کیا ہے، اور بعد ازاں مارکوئیس آف ولزلی کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:۔

"موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے، کہ نام نامی اور اسم گرامی اُس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس

ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ مؤلف نے ۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا! اس کے مادہ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۱۵ھ ہجری میں لکھی گئی۔

"حیراں پھریں ہیں بے سروپا بہمن اور دے"
"تاریخ اس کی جب سے کہ رشک بہشت ہے"
۱۲ - ۱۲۲۷ = ۱۲۱۵ھ ہجری

اور غالباً یہی سال اختتام تذکرہ کا بھی ہے۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس فرمایش کے بعد نہیں، تو اول ضرور حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے، کیوں کہ ان کے کلام میں وہ قصاید درج ہیں جو انہوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ، اور میر عالم کی مدح میں لکھے تھے۔ اعظم الامرا مرہٹوں کی قید سے نجات پانے کے بعد دوبارہ ۱۷۹۷ء میں وزیر مقرر ہوے، اور مئی ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد اسی سال میر عالم وزیر ہوئے، اور ۱۸۰۸ء میں وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اس زمانے میں حیدرآباد چلے گئے تھے۔ چوں کہ ان کو زیادہ تر یا تو انگریزوں سے سابقہ رہا ہے، یا اہل حیدرآباد سے، اس لئے انہوں نے ایک شعر میں اس تعلی کو بڑی خوبی

---

۵۷ ڈاکٹر جان گلکرسٹ ۱۲

سے ادا کیا ہے، کہتے ہیں :۔

"ہوا آوارہ ہندستاں سے لطف آگے خدا جانے"

"دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے"

جو قصیدہ اُنہوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی وہ فراغ بال اور خوش حال تھے، اور دکن میں جاکر ارسطو جاہ کے ہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے ملازم ہو گئے تھے، مگر اس تنخواہ سے خوش نہیں تھے، اضافے کی درخواست کرتے ہیں اور بڑے زور سے کرتے ہیں :۔

کل ہی کی بات ہے، یہ مسافر وطن میں تھا
سو دو سو آشنا کا حقِ بندگی گزار

"شکرِ خدا، کہ آج بیک بینی و دو گوش
گرچہ دکن میں ہے، نہیں ہر دیدہ خوار و زار

"ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکوں
لازم و گرنہ تھا بشریت کو اضطرار

"اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہے غرض
سو یہ ہے، اے امیر فلک قدر و کے تبار!

"سرکار سے تری جو زراہِ تفضلات
ہے ڈیڑھ سو روپے ترے خادم کا ماہوار

"ہر چند جائے شکر ہے، پر عرض کیا کروں
جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل او نہار

"بے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے
ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار

"خلقِ خدا کا بار اُٹھاتی ہے پالکی
میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار

"باقی جو سو رہے، کئی دن میں زباں پہ پھر
مثلِ مجرداتِ خفقان کا ہے شمار

"تجھ سا ہو قدر دانِ نکات، اور یہ نکتہ سنج
یوں ہو اسیر پنجۂ چرخ ستم شعار

"فضل و ہنر جو مجھ میں ہے وہ سب بیک طرف
اور قدردانیاں بھی تری سب بہ یک کنار

"ہے ہمتِ بلند کا تیری جو اقتضا
اس امر میں تو ہے تجھے آیندہ اختیار

"از بس کہ کم دماغ ہوں ضیقِ معاش سے
بالفعل تو اضافے کا ہوں گا اُمیدوار

"لیکن نہ وہ اضافہ جو ہووے برائے نام
گر ہوں سو پچاس میں گرہ کشودہ کار

تضعیف مِل چاہتا ہی تجھ سے ضعیف	کیوں کرے بے حیائی نہیں ہوتی بارہا
غالب ہے تجھ پہ شاق نہ ہوں تیرے تین سو	چھ سو جب اُنیوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار

جو شکایت شاعر نے اخیر شعر میں کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں قدیم سے چلی آرہی ہے، اور اب تک باقی ہے۔

اس قصیدے میں شاعر نے تعلی کی لی ہے، اور ناصر علی کا ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار خاں کی مدح میں اس نے قصیدہ کہا اور صرف اس کے اس مطلع پر۔

"اے شان حیدری زجبینِ تو آشکار
نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار"

امیر الامراء نے زر و سیم نثار کیا۔ پھر اس مطلع کو پڑھ کر کہتا ہے کہ اس میں کیا رکھا ہے:۔

"خیر لفظِ ذوالفقار نہیں اس میں کوئی بات — ایسی کہ ڈال دیویں سپر جس کے آگے یار"
"آئینِ قدردانی میں لیکن برائے نام — لازم یہی ہے کر گیا جو خانِ با وقار"

اور پھر خود اس مطلع کا جواب لکھتا ہے:۔

"کتنی ہے فارسی میں بھی طبع مطلعے — ہاں در جوابِ مطلعِ ناصر علی بیار
"اے ذرہ ہا زنامِ تو خورشید اعتبار — تاثیر اسمِ اعظم از اسمِ تو آشکار"

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس میں بھی سوائے لفظ اعظم کے اور کیا رکھا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے یہ مطلع ناصر علی کے مطلع کو نہیں پہنچتا۔

میر عالم بہادر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس میں بھی یہی رونا رویا ہے،

"پر اتنی عرض اے حاجت روائے خلق ہی تجھ سے — کہ میں خواہاں نہیں کچھ ملک و کوس و طبل و لشکر کا
"توجہ اتنی فرما تو کہ با یحتاج کی رو سے — نہ ہوں محتاج عند الوقت سیم و زر و گوہر کا"

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ اپنے تذکرہ شعرا گلشن بیخار میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میرزا لطف کچھ دنوں نواح عظیم آباد میں بھی رہے ہیں، اور نسبت شاگردی میر تقی سے رکھتے ہیں۔"

لیکن خود میرزا لطف اپنے حال میں یہ لکھتے ہیں :-

"اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے"

اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہیئے - اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ میر تقی کے بہت بڑے مداح اور ماننے والے ہیں، اور غالباً اسی وجہ سے وہ ان کی شاگردی سے منسوب کردیئے گئے ہیں۔ لطف ایک معمولی شاعر ہیں، غزل و قصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہے، مگر کلام میں لطف نہیں۔ البتہ یہ تذکرہ اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جو اُردو زبان میں قابل یادگار ہے۔ چوں کہ ایک انگریز با اقتدار کی فرمایش سے لکھا ہے، زبان صاف اور سادہ ہے، تاہم قافیئے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تذکرے اگرچہ اَور بھی لکھے گئے ہیں، مگر اس میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ جس سے یہ درحقیقت قابل قدر ہے۔

۱- اوّل تو سو برس پہلے کی زبان ہے، جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتہ لگ سکتا ہے، اور محقق علم اللسان کو، اور نیز اُن لوگوں کو جنھیں زبان کا چسکا ہے، بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی، وہ یہ ہے، کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرّہ بول چال میں آتے ہیں، اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں، وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں۔ مثلاً "کر کے" کا خاص استعمال، جو ہم یہاں ہر روز سنتے ہیں، اس تذکرے میں بھی جا بجا پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں :-

"شورش تخلص، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر پھنا "کر کے" تھے"

اسی طرح میر قمر الدین منّت کے حال میں لکھا ہے :-

"چنانچہ شکرستاں 'کر کے' ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے"

دکن میں بعض لوگ "بعد میں" کی جگہ "بعد از" بولتے ہیں، سوز نے ایک شعر میں یہی لفظ لکھا ہے :-

"ہے جیتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا   رہے گا مرگ کے 'بعد از' مزار میں رونا"

فعل کے بعض استعمال بھی بعض اوقات بالکل ایسے ہیں جو ہم حیدرآباد میں اکثر سنتے ہیں مثلاً: فعل متعدی میں فعل بہ لحاظ مفعول کے آتا ہے، مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے۔ دکن میں عموماً اسی طرح بولتے ہیں۔ ضیا کے حال میں لکھا ہے:-

"دلی سے جبکہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا وہیں ٹھیرے"

فقیر کے تذکرے میں لکھتے ہیں:-

"بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے"

دکن میں عام طور پر "میں کہا" بولتے ہیں، قائم کہتے ہیں:-

"میں کہا، عہد کیا کیا تھا رات،

"ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں"

٢- دوسرے علاوہ اس کے کہ مؤلف ایسے زمانے میں تھا جب کہ اُردو زبان عروج پر تھی، اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے، مولف ان کا ہم عصر تھا، اور ان میں سے اکثر سے ان کی شناسائی اور دوستی بھی" اور اس لئے جس وثوق اور صحت کے ساتھ اُن کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ مثلاً: رزیڈنٹ لکھنؤ کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبان ریختہ میں تالیف و تصنیف کے لئے طلب کرنا، اور بوجہ پیرانہ سالی اُن کا منتخب نہ ہونا۔ یا میر صاحب ہی کے حال میں ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے، اور جو صرف اس تذکرے کا مؤلف ہی لکھ سکتا تھا، کیوں کہ وہ ان کا دیکھنے والا تھا اور خاص ارادت رکھتا تھا۔ علاوہ اس کے اس سے میر صاحب کی اس خاص وضع اور طبیعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، جو انہوں نے عمر بھر نباہی۔ وہ لکھتا ہے:-

"ناقدردانی سے اغنیا کی، اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوائے شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد ہا کہ میر سا شاعر، جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی

"بیان ہیں معانی پرواز ہے مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں پوچھتا اُس کی آج ہے"۔

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنی کتاب آبحیات میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جب میر صاحب لکھنؤ آئے تو نواب آصف الدولہ نے دو سو روپیہ مہینہ کر دیا، مگر چوں کہ بد مزاج نہایت درجے کے تھے نواب سے بگاڑ کر لیا، اور گھر بیٹھ رہے، اور زندگی فقر و فاقے میں گزار دی"۔

مگر اس تذکرے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں، کیوں کہ اس میں لکھا ہے کہ:۔

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت فاخرہ دیا، اور تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کر دیا، اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہ ہوا، اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج کے دن تک، کہ ۱۲۱۵ہجری ہیں، وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا"۔

مگر صاحب تذکرہ کا چند سطر اوپر یہ لکھنا کہ وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے یا تو مبالغہ ہے، یا یہ ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں اُن کے کمال کی پوری قدر نہ ہوئی۔ غرض یہ کہ بعض باتیں اس میں نئی نظر آتی ہیں۔

۳۔ تیسرے، صاحب تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہے، کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت یا کسی قدر تعلق سلطنت سے رہا ہے، ان کے تذکرے میں تاریخی حالات بھی خوب خوب لکھے ہیں۔ چنانچہ شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب کے حال میں ان کا بزمانہ ولی عہدی عماد الملک کے خوف سے دلی چھوڑنا، باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا، اور ان کا ۱۱۷۳ہجری میں تخت نشین ہونا، رام نرائن سے جنگ، دلیر خاں کی دلیری اور جان نثاری، فتح و نصرت کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ، بالتفصیل لکھا ہے۔ اور اخیر میں کورنمک سنگدل غلام قادر خاں روہیلے کا دردناک واقعہ بھی درج کیا ہے؛ اور بادشاہ کی دردناک غزل بھی نقل کر دی ہے، جس میں یہ واقعہ منظوم ہے، اور خود اُردو نظم میں ترجمہ کر کے متن میں درج کی ہے، اس لئے کہ تذکرہ اُردو کا ہے، اور اصل غزل حاشئے پر لکھ دی ہے؛ البتہ اتنا تکلف کیا ہے۔ اسی طرح تانا شاہ، آصف الدولہ، اور

مرزا محمد رضا اُمید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات اور قصص لکھے ہیں۔ خصوصاً میرزا محمد رضا اُمید کے تذکرے میں، امیر الامرا حسین علی خاں، اور ان کے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کئے ہیں۔

۴۔ چوتھے اس کتاب سے زمانے کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور یہ بات تو صاف صاف نظر آتی ہے، کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بے فکرا تھا، اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ اخیر میں جب ہمارے بادشاہ، نواب اور امرا اس طرف جھکے، تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے۔ ان لوگوں نے رہا سہا اُنہیں اَور کھو دیا۔ مُلک گیری اور ملک داری کبھی کی جا چکی تھی، اس لئے اولوالعزمی اور ہمت بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ جسمانی اور دماغی قوتٰی میں انحطاط پیدا ہو گیا تھا، ایسی حالت میں حقیقی مسرت کہاں! البتہ عارضی خوش حالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی، شعر شاعری نے اس کا سامان اَور مہیا کر دیا، دیوانہ را ہوئے بس است، شاعروں کی بن آئی، وہ تو اس شغل میں رہے، اور یہاں کام تمام ہو گیا۔ اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے، جن کے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے، اس کے خاص خاص آداب تھے، بڑے بوڑھے نوجوان بچے سب ہی شریک ہوتے تھے، باکمال سخن وروں کو دل کھول کے داد دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے، اور تھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ نوجوان ان مشاعروں میں شریک ہوتے، اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے، جو شعرا کے لئے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا، تو ان کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوتی تھی، کسی اُستاد کے پاس حاضر ہوئے، شاگرد ہو گئے، اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گویا شعر کہنے کے لئے صرف کسی اُستاد کا شاگرد ہو جانا کافی ہے۔ یہ مشاعرے درحقیقت شاعر گر تھے۔ میں ان مشاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی حالت کیا ہو گی؟

علاوہ اس عام حالت کے، تذکرے میں جو بعض باتیں ضمناً بیان کر دی ہیں، وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ایک واقعہ، جس کا مجھ پر بھی اثر ہوا، یہ ہے کہ نواب وزیر اودھ اُس زمانے میں جب کہ ان کا عروج اقبال تھا، اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، تب بھی شاہان دہلی اور ان کے

گھرانے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اور تعظیم بھی ایسی کہ آج کل کے نوجوانوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ چنانچہ میرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۹۸ھ ہجری میں دلّی سے لکھنو چلے آئے تھے:-

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب آداب و خدمت گزاری کے تھے، سب ادا کئے، خواصی میں بیٹھنے کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے، باوصف اس نازپروری کے کبھی پیادہ قدم کا ہے کو چلے تھے پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ مجراگاہ پر سے جاکر آداب بجالاتے تھے"

۵- پانچویں، بعض ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہے جس کی نسبت اُردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اُردو کے شاعر تھے، اور اُن کا تخلص اشتیاق تھا۔ یا عبد القادر بیدل بھی اُردو میں شعر کہتے تھے۔ یا تانا شاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے، جو آدھا اُردو اور آدھا ہندی ہے۔ بعض ایسے شعرا کا بھی کلام درج ہے کہ جن کا نام تو بہت مشہور ہے مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنے تذکرہ آبحیات میں لکھتے ہیں کہ:-

"ایک موقع پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مطابق پڑا، چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈھالا ہے، اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنو کی ہجو کی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی، اور چھڑیوں والوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے۔ میں نے یہ مثنوی دلّی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی، اب نہیں ملتی، لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں"۔

حسن اتفاق سے صاحب تذکرہ نے اس مثنوی کا وہ حصہ، جس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو ہے۔ میر حسن کے حالات میں نقل کر دیا ہے۔ ناظرین کو لکھنو کی ہجو میں یہ شعر دیکھ کر بہت تعجب ہوگا۔

"زبس کو فہ سے یہ شہر ہم عدد ہے اگر شیعہ کہے نیک اس کو بد ہے"

اس مثنوی کا نام غالباً گلزار ارم تھا۔ میر حسن کے دوسرے کلام کا بھی انتخاب کیا ہے: درحقیقت کلام سب اچھا ہے، مگر افسوس آج کل نہیں ملتا۔

خواجہ میر درد کے بھائی، میاں سید محمد میر اثر، کی مثنوی خواب و خیال اب تک سُنی ہی سنی تھی، اس کے

چند شعرائے حالات میں درج ہیں شمس العلما مولوی شبلی نے اس پر مفصلہ ذیل نوٹ لکھا ہے، جو کتاب کے صفحہ ۴۳ پر درج ہے:

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنو کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چوں کہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی، اور اس کا طرز اُڑایا تھا۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں، کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے"۔

ہمیں تعجب ہے، کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف "اعتراف" کا لفظ لکھا ہے، حالاں کہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بیحد تعریف کی ہے، سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ "لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے" بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف و ثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر و انیس میں انہیں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کو جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے، مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے، حالاں کہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی عام شاعری پر، یا اُردو شاعری کے نشو و نما اور اُس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے، تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر آگیا ہے، اور اس میں دلی لکھنو والے دونوں ہیں، اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کر لیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شایق ہیں تنقید کے روادار نہیں۔ مولنا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے، وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں، بلکہ اُردو میں فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے۔ اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے، جو صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہو سکتی ہیں، تو لوگوں کے عام، (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا، اور وہ بت جنہیں وہ مدت سے پوجتے چلے آرہے تھے، یکایک متزلزل ہو گئے، اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہو گیا ہے۔ مولنا نے اس کے

ـــــــــــــــ

سلہ شمس العلما مولوی شبلی نے ازراہ نوازش اس تذکرہ پر جا بجا نوٹ تحریر فرمائے ہیں۔

خواہ مخواہ اس لئے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ درحقیقت وہ اُس رتبے کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے ناسمجھی سے اُسے دے رکھا ہے۔ مجھے تو اُلٹی یہ شکایت ہے کہ مولنا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے، جو اگرچہ صریح اور بیّن ہیں، مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اُس کی پوری قلعی کھُل جائے حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اُردو زبان سے کچھ تعلق ہی نہیں، مولنا کا اگر اس میں قصور ہے تو صرف اتنا کہ انہوں نے دن کو دن اور رات کو رات کہدیا ہے۔ اب ہم خواجہ اثرؔ کی مثنوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

اول تو اس مثنوی کی تعریف سب کرتے چلے آتے ہیں، چنانچہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں لکھتا ہے:۔

"مثنوی ایشان شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورہ بحت است، وازیں جہت مرغوب عام"

مولوی محمد حسین آزاد آبِ حیات میں کہتے ہیں کہ:۔

"ایک مثنوی خواب وخیال ان کی مشہور ہے، اور بہت اچھی لکھی ہے"

دوسرے ان کے کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں درد، زبان کی صفائی، شُستگی اور لطافت بدرجۂ کمال موجود ہے، اور یہ سب باتیں مثنوی کے لئے خاص طور پر مناسب ہیں۔ مگر صاحب تذکرہ نے غضب یہ کیا ہے، کہ مثنوی کا وہ حصہ منتخب کیا، جس سے کسی طرح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا سراپا کا مضمون اس قدر مُبتذل ہے کہ اس میں کوئی نیا مضمون پیدا کرنا، یا اس میں زبان کی فصاحت وسلاست دکھانا بہت مشکل ہے۔ اور چوں کہ اس مثنوی کی تعریف زیادہ تر زبان کی ہے، اس لئے صرف سراپا کے چند اشعار پر سے حکم لگانا درست نہیں ہے۔ صاحب تذکرہ نے اپنے اس ذوق کا ثبوت اور بھی ایک آدھ جگہ دیا ہے، مثلاً جوشش کے کلام کو پسند نہیں کرتا، مگر انتخابی اشعار بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح مصحفی کی تعریف کی ہے، لیکن انتخاب اس قدر خراب دیا ہے کہ اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اچھا شاعر ہے، لیکن اس کا کیا جواب ہے، کہ جو شعر خواجہ اثرؔ کا بہ تبدیل لفظ شوقؔ نے اپنا کر لیا ہے، یعنی:۔

اثر   ہاتھا پائی میں ہاسے نپتے جانا   کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا

شوق　　ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا　　چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسا شعر یا خواجہ اثر کہہ سکتے تھے یا ان کے بعد نواب میرزا شوق، اگر یہ شعر ان کا ہے تو یہ کہنے کی پوری وجہ ہے، کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گزری ہے، تو اس طرز کا اثر ضرور اس پر پڑا ہوگا۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:۔

"خواب وخیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے بہار عشق میں موجود ہیں"

یہ ایک مزید ثبوت ہے۔

دوسرے یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ مثنوی اُس زمانے میں لکھی گئی جب کہ اُردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی۔ باوجود اس کے مولانا حالی نے صاف لکھ دیا ہے:۔

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب وخیال کو بہار عشق سے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی"

اخیر اس میں تو ظاہرا ایک حد تک کچھ گنجایش بھی نظر آتی ہے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جسے لالہ چکبست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بطور سند کے درج فرمایا ہے، تعجب ہے، کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں۔ اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں، سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پُر ہے۔ ہم اس موقع پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے، اور اس بحث کے لئے بھی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں، موقع آپڑا تھا اس لئے یہ چند الفاظ لکھے گئے۔

۶۔ چھٹے، صاحب تذکرہ نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں، جن میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے، مثلاً: شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"قرۃ العین فی ابطال شہادت الحسنین اور جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ ان کی تصانیف سے ہیں"

حالاں کہ ان مباحث میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ نہ شہادت حسنین کا ابطال کیا ہے، نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے، یہ محض اتہام ہے۔ اس کے بعد یہ کہہ کر کہ "یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے" خوب ہجو ملیح کی ہے، اور آخر میں یہ لکھا ہے:۔

"کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے، فی الواقع لئیمالی مقداروں کے حالی مقدار ہی ہوتے ہیں اور نابکاروں کے نابکار۔ بقول شاعر کے"۔

"شیر کے نیچے میں گوشت شیر سے افزوں ہے بھونا ہیں کتے کی بلی بی گی موجود ہے"

یا مظہر جان جاناں کے حالات میں لکھتے ہیں :۔

"۱۱۹۵ھ ہجری تھے کہ اس روشن ساز مسایل صدیقی نے، اور اس مسقلہ پرداز احکام فاروقی نے، اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کی منازل کے طریق پر کیا"۔

یا تانا شاہ کے حالات میں مؤلف عالمگیر کی نسبت یوں گوہر فشانی کرتا ہے کہ :۔

"خلد مکاں نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے"

مکہ مسجد کا کھدوانا نرا بہتان اور صریح جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ مولف نے جو خود حیدر آباد میں رہا ہے، اس کذب کا لکھنا کیوں کر گوارا کیا۔ ہمیں شاید ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں، کہ مکہ مسجد موجود ہے، اور اب تک نظر بد سے محفوظ ہے۔

لیکن قطع نظر ان امور کے وہ بعض وقت سچ کہنے سے بھی درگذر نہیں کرتا، مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں، ان کی داد و دہش اور مروت کی بے انتہا بیشتی کی ہے، لیکن آخر میں صاف لکھ دیا ہے۔

"افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی، نائبوں کے ہاتھ میں اعالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ سیر و شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لایق اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا"۔

یا سراج الدین علی خاں آرزو نے، جو نکتہ چینی شیخ علی حزیں کے کلام پر کی ہے، اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ :۔

"عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے، نہیں صاف نزاع معلوم ہوتی ہے، جب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے"۔

اس تذکرے کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اور خصوصاً نامور اور مشہور اساتذہ سب کے سب دلی کے تھے۔ دلی کو جہاں یہ فخر ہے کہ اردو نے اس میں جنم لیا، وہاں اس کا یہ فخر بھی بجا ہے، کہ جتنے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں وہ یہیں کے تھے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے، زمانہ قدیم سے محسود آفاق اور مرجع خلایق رہا، کبھی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی راج دہانی، کبھی سلاطین

اسلام کا دار الخلافت، کبھی طغیانی کی بدولت بہ کر خراب ہوا اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا، کبھی معرکہ جنگ و جدل و قتل عام ہے، اور کبھی گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے، کبھی تخت گاہ شاہان اور مرجع کمال ہے، اور کبھی ایک مطلق العنان سودائی کی لٹک سے خاصہ کھنڈر ہے، کبھی مورد بلیات و آفات ہے، اور کبھی منزل حسنات و برکات، غرض یہ نگری یوہیں اُجڑتی اور بستی، بگڑتی اور بنتی رہی، مگر باوجود اس کے اس کے حسن عالم فروز میں نئی ادا پیدا ہوتی رہی، اور ہر حادثہ کے بعد فوراً سنبھل گئی لیکن اخیر زمانے میں، جب سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامات پیدا ہو گئیں، تو وہ ایک چھپکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہو گیا سب سے اول نادر شاہ کا ایسا تھپیڑا لگا، کہ اس نے بٹھا ہی تو دیا، اس کے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی، پھر مرہٹوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہا سہا سب خاک میں ملا دیا، اب تک جو باکمال دلی میں پڑے وضعداری نباہ رہے تھے۔ ان حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے۔ سوائے ایک میر درد کے جن کی نسبت صاحب تذکرہ لکھتے ہیں

> "جس ایام میں معمورہ شاہ جہان آباد کا، اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہل کمال سے، اور کثرت منتخبان عدیم المثال سے، رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا، تو معمورے پر شہر کے عرصہ ربع مسکوں کا تنگ، اور اس خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا۔ جب کہ متواتر نزول آفات کے باعث، اور مکرر ورود بلیات کے سبب خراب ہوا، اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے، اور ہر ایک صاحب زاویہ گزین نے اور ہر ایک تونگر مالدار نے، اور ہر امیر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا، اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا، مگر وہ سید والا تبار، کہ نام نامی اُس کا خواجہ میر تھا، اس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے، اور حامل جفاؤں کے ہوئے، اور شاہ جہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنے کنج عزلت سے نہ گئے"

ایسے وقت میں شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں، بڑے بڑے وضعداروں اور متوکلوں کی ٹھیک نکل جاتی ہے۔ دلی کے اُجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا۔ اقبال نے کچھ دنوں اس کا ساتھ دیا، اب لے دے کے صرف یہی ایک ٹھکانا اور آسرا مسلمانوں کا رہ گیا تھا: آصف الدولہ سا لکھ لٹ نواب تھا، اہل کمال کی قدر ہونے لگی، پھر تو جو اُٹھا وہیں پہنچا، اور پہنچ کر وہیں کا ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو پہنچے، اس کے بعد سودا تشریف لے گئے، سودا کے انتقال کے بعد میر تقی نے ۱۷۸۲ء میں دلی سے لکھنؤ کا رخ فرمایا

میر صاحب کے جاتے ہی دلی سونی ہو گئی، اور میر حسن، میر سوز، جرات، سب لکھنؤ میں جا بسے، اور دلی کی رونق لکھنؤ میں آگئی اس طرح لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی، اب پھر لکھنؤ کی سوسائٹی کا اردو زبان اور اردو شاعری پر کیا اثر ہوا سو ہماری بحث خارج ہے

مجھے خیال تھا کہ اس تذکرے سے میر انشاء اللہ خان کے متعلق کوئی نئی بات معلوم ہو گی، اور کم سے کم اُس قصے کی تحقیق ہو جائے گی جو شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے ان کے اخیر زندگی کے متعلق لکھا ہے، مگر یہ تذکرہ ۱۲۱۵ھ ہجری میں لکھا گیا، اور ۱۲۱۵ھ تک میر انشاء اللہ خاں میرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے، یا اسی سال نواب سعادت علی خاں کے ہاں رسائی ہوئی، کیوں کہ میرزا سلیمان شکوہ اسی سال (۱۲۱۵ھ) لکھنؤ سے واپس دلی چلے گئے۔ یہ واقعہ آزاد نے سعادت یار خاں رنگیں کی زبانی بیان کیا ہے، صرف یہ لکھ کر تمام واقعہ بیان کر دیا ہے کہ "سعادت یار خاں رنگیں کہا کرتے تھے" مگر یہ نہ معلوم ہوا کس سے کہتے تھے، اور آزاد نے کس سے سُنا۔ آب حیات میں بعض بعض جگہ وہ مجالس رنگیں کا حوالہ دیتے ہیں، مگر مجالس رنگیں میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اتفاق سے مجالس رنگیں بھی ۱۲۱۵ھ میں لکھی گئی، میر انشاء اللہ خاں اور سعادت یار خاں رنگیں دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے۔ اور چوں کہ یہ واقعہ بہت بعد کا ہے اس لئے یوں بھی اس میں نہیں ہو سکتا۔ کیا اچھا ہوتا اگر مولوی محمد حسین آزاد اس روایت کا سلسلہ بیان کر دیتے۔

مولف نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے :-

"یہ کتاب ہم نے دو حصوں میں لکھی ہے، یہ پہلا حصہ ہے جس میں سلاطین نامدار، امرائے عالی مقدار، اور شعرائے صاحب وقار، کے حالات لکھے گئے ہیں، دوسری جلد میں غیر مشہور شعرا کا تذکرہ ہو گا۔"

اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں کہ لکھی گئی تھی یا نہیں۔

مولف نے شعرا کا کلام جو بطور انتخاب کے درج کیا ہے اُس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے۔ صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے ہیں، مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا ان کے کلام کو بجنسہ ویسا ہی رہنے دیا ہے۔ خود مولف نے اپنے کلام سے صفحہ کے صفحے رنگ دئے تھے، اس میں بھی انتخاب کر دیا گیا ہے۔

اب مجھے اس تذکرے کے متعلق اس قدر اور کہنا باقی ہے کہ اس کے طبع ہونے سے اردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہو گا، اور جو لوگ اردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے۔

عبد الحق بی۔ اے (پرنسپل مدرسہ آصفیہ)
حیدر آباد دکن، اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء

زمانہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رعنائی اور زیبائی، دلبرانِ سخن کو اُس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے، جس نے معشوقانِ زبانِ ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ پہنایا۔ دلربائی اور رنگیں ادائی، نازفروشان ناطقہ کو اُس بے نیاز کی ثنا سے شامل ہے، جس نے محبوبانِ کلامِ اُردو کو زیورِ الفاظ عربی اور فارسی کی آرائش کے ساتھ خرام ناز سکھایا۔

ثنا اور حمد ہے اُس ذوالمنن کو ۔۔۔ یہ بخشی جس نے رنگینی سخن کو
چمن[لہ] کے ہم نے معنی کی جو لی باس ۔۔۔ تو ہر گل کی نئی بُو ہے نئی باس

سرسبزی اور شادابی، چمنِ بیان نے اُس بہارِ گلشنِ نبوت کی نعت سے پائی، جس کی آبیاریِ فیضِ عام کے باعث خارخارِ نظمِ دلخراش اُردو کا رشکِ رگِ گل ہے۔ نزو تازگی اور سبزی گلبن معانی کو اُس رونق گلزار رسالت کی توصیف نے عطا فرمائی، جس کی نسیم منعت کی موج زنی سے ہر فقرۂ پریشان نظمِ ریختہ کا حسرتِ سنبل ہے۔ **قطعہ**

رحمۃٌ للعالمیں جب سے سنی ہے اُس کی ذات ۔۔۔ گرمیِ خورشیدِ محشر سے نہیں کچھ بیم ہے
گو ہمارے جرم ہم کو آتشِ نمرود ہوں ۔۔۔ وہ شفیع اپنا ہے، تو گلزارِ ابراہیم ہے

لہ اس مصرعہ میں تعقید ہے، اصل عبارت یوں ہے "معنی کے چمن کی جو ہم نے باس لی"، باس لینا یعنی خوشبو سونگھنا۔

آبداری تیغ زباں کو اُس جوہر شمشیر شجاعت کی منقبت نے بخشی ہے، جس کی سیفِ دشمن گداز کے مضمون نے دو مصرعۂ آبدار کو بخشا رتبہ ذوالفقار[1] کا۔ اور وسعت میدانِ سخن طرازی کو اُس شہسوار عرصۂ یکہ تازی کی تعریف نے عطا کی ہے، جس کی کشت گلگوں کی تحریر سے کمیتِ خامہ کرتا ہے صفحۂ کاغذ کو تختۂ گلزار کا

ہے گلستانِ ولایت کا وہ باب — تذکرے کا علمِ دیں کے انتخاب
لفظ و معنی مصرعِ آئیں کا ہے — مطلعِ دلکش بیاضِ دیں کا ہے
مدِّ بسم اللہِ سرِ لوحِ نجات — شاہ بیتِ کُلّیاتِ کائنات
اور فرزند اُس کے عالی دودماں — تا جنابِ حضرتِ صاحب زماں
آلِ پیغمبر اور اصحابِ کرام — ہو نزولِ رحمت اُن پر اور سلام

بعد حمد اور صلوٰۃ کے، رنگ دینے والوں کو چمن بیان کے معلوم ہووے، کہ شاہ گیتی افروز روشن ضمیر، شاہ عالم بادشاہ غازی کی بادشاہت میں، اور شمعِ شبستانِ دولت و اقبال وزیر اعظم ہندوستان نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ کی وزارت میں، اور رونقِ بزم انصاف و عدالت نواب عماد الدولہ امیر الممالک گورنر جنرل وارن[2] ہیسٹن جلادت جنگ بہادر کی ریاست اور امارت میں، علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے، اور نام اُس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے ۱۱۹۶ھ گیارہ سو چھیانوے ہجری اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب سر حلقۂ بزم نکتہ دانی، رونق افزائے محفلِ معانی، سخن کی جان، اور سخن دانوں کی قدردان، صاحب والا مناقب، مسٹر گلگرسٹ[3] صاحب کی نظر مبارک سے گذرا

؎1 یعنی ذوالفقار کا رتبہ بخشا ۱۲

؎2 اس عہد ہندوستان کے گورنر جنرل، دلی کے دربار سے خطاب حاصل کرتے تھے، اور اُس کو فخریہ تحریر و تقریر میں استعمال کرتے تھے ۱۲

؎3 یہ وہی گلگرسٹ صاحب ہیں جن کے ایما سے میر امنؔ صاحب نے چار درویش لکھی۔ درحقیقت اُردو زبان کا رفارمر یہی شخص ہے ۱۲

ازبس کہ شاعروں کا احوال اُس میں مجمل لکھا تھا، ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبانِ ریختہ میں کیا جائے، تو خوب ہو، اور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے، تو نہایت طبع کے مرغوب ہو۔ مبتدی اس سے بڑا مزا پائیں گے، اور نومشق کیفیت بہت اُٹھائینگے۔

چنانچہ اس خیر خواہ خفی وجلی، میرزا علی کو، کہ لطف تخلص کرتا ہے، نہایت محبت و اخلاق سے فرمایا کہ "تو اگر تن دہی اس مقدمہ میں کرے، تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں"۔ اگرچہ یہ پابندِ اُلفت کا اس ایام میں ارادہ حیدر آباد کی سیر کا رکھتا تھا، لیکن اس خُلقِ مجسّم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا، کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا، کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں، اور ایک سرِ مو آپکے فرمانے سے نہیں باہر ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ خلق بھی سحر حلال ہے، جن لوگوں کا یہ آئین ہے اُن کا خوشا حال ہے۔ غرض مدعائے دلی اُس صاحب عالی تدبیر کا یہ معلوم ہوا، کہ ان فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد ہمیں یہ ہے کہ صاحبان انگریز[۱] تازہ ولایت سے جو آتے ہیں، ہم اُن کی تربیت کے لئے سارا یہ خونِ جگر کھاتے ہیں، تاکہ اُن کے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے، اور اُن کی طبیعت اُس سے بخوبی مزا اُٹھاوے۔ تو بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظ عربی اگر آوے، تو ایسا جس کو مبتدی دیکھ کر کہیں "سبحان اللہ" اور لفظ فارسی جگہ پاوے، تو ویسا جس کو نومشق پڑھ کر کہیں "واہ واہ"۔ اُمید جناب اقدس الٰہی سے یہ ہے کہ اس طور پر سرانجام اور مقبولِ نگاہِ خاص و عام ہو۔

الحمدللہ آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک مطابق عیسوی

---

[۱] اس فقرہ سے اندازہ کرو کہ اس وقت کے اہلِ قلم، سادہ اُردو لکھنے کو کس قدر خلاف شان سمجھتے تھے مصنف صاحبان انگریز پر احسان رکھتا ہے کہ ان کی خاطر سے اس نے یہ ذلت گوارا کی ۱۲

کے ہیں، عہدِ سلطنت قایم ہے ایسے بادشاہ روشن دل خدا پرست سے، جس کی چشم حقیقت بیں کے سامنے دلقِ گدائی اور خلعتِ شاہی برابر ہے، اور نظر معرفت اثر کے روبرو مساوی کلاہِ فقیر اور تاجِ اسکندر ہے۔ تخت نشین بارگاہِ سرفرازی، **شاہ عالم بادشاہ غازی**، قایم رکھے اللہ تعالیٰ اس شاہِ بے آزار کو، اور زیادہ کرے اُس کی قدرت اور اقتدار کو۔ اور بالفعل مسندِ وزارت کو زیب اور زینت اُس رونق بخشِ بزمِ عیش و کامرانی سے ہے، جس کی محفل عیش و نشاط کی غیرت سے تعجب نہیں ہے کہ زہرہ غرق عرقِ پشیمانی میں ہو، اور مشتری مانند آئینہ کے گرفتار بندِ حیرانی میں۔ ساغر نوشِ خمخانۂ دولت و اقبال، مخمور بادۂ جاہ جلال، یمین الدولہ ناظم الملک **سعادت علی خاں** بہادر مبارز جنگ، ساقی روزگار جام اُمید کو اُس کے شراب مراد سے چھلکتا رکھے اور اس ایام فرخندہ فرجام میں محفل حکومت اور ایالت اُس امیر صاحب تدبیر سے رونق پذیر ہے، جس کی بہارِ گلشنِ عدالت میں تحقیقات ہے چاکِ گریبان گل کی[ل]، اور پرسش ہے نالۂ دلخراشِ بلبل کی، کہ گل کا گریبان کیوں چاک ہے؟ اور بلبل کی آواز کیوں دردناک ہے؟ سوسن کی زبان بندی سو سو بار ہوتی ہے، اور نرگس کے احوال کی تلاش ہے کہ راتوں کو کیوں نہیں سوتی ہے؟ اس زبان داری پر کیا باعث ہے سوسن کی بے زبانی کا؟ اس چشم خماری پر کیا موجب ہے، نرگس کی حیرانی کا؟ قمری کے طوقِ گردن کی جست وجو ہے، اور صدا اُس کی "جو کو کو" ہے، اُس میں گفتگو ہے، کہ کسی چیز کا اس کی گم ہونا ثابت ہوتا ہے لفظِ "کوکو" کی تکرار سے، گلا اس کا باندھا گیا کس تقصیر کے اقرار سے غنچہ کی گٹھری کو نسیم بے اجازت بہار کے کھولے، تو صاحبِ تقصیر ہے، اور زرِ نقد کو گل کے خزاں ہنسی سے بھی ٹٹولے، تو واجب التعذیر ہے۔

سبحان اللہ عدل اور انصاف ویسا کہ جس کا شکر بیان ہے۔ عقل اور فراست ایسی کہ جس

ل یعنی گریبان گل کی چاک کی تحقیقات ہے ۱۲

میں قاصر زبان ہے ارسطو کو سامنے تقریر کے دعویٰ طفل دبستانی کا، اور افلاطون کو روبرو تحریر کے اظہار ہیچدانی کا۔ یہاں تک تو اُس کی قدردانی سے اب علم کا رواج ہے، کہ مملکتِ جہل جاہلوں کے ہاتھوں سے ہوتی جاتی تاراج ہے۔ معمارِ حکم نے اُس کے وہ مدرسۂ عالی شان بنا کیا ہے، جس کے بامِ عرش مقام کی پہلی سیڑھی اگر ساتویں آسمان کو کہئے تو بجا ہے۔ کرسی شاہ نشین کی گھمنڈ عرش نشانی کا رکھتی ہے۔ نسبت اس کو بیت الشرفِ آفتاب سے کیونکر دی جا سکتی ہے۔ صفائی کو دیوار کی دیکھ کر فقط آئینہ ہی حیرت سے نہیں پشت بر دیوار ہے، بلکہ شرمندگی سے پانی پانی گوہر آبدار ہے۔ تعریف سے اُس امیر عالی منزلت کی عہدہ برآ ہونا مجال نہیں ہے زبان کی، اور توصیف سے اُس والا مرتبت کی نکتہ سرا ہونا طاقت نہیں ہے بیان کی۔ شہسوارِ معرکۂ دشمن ستیزی، سرحلقۂ گروہِ خرد پژوہ انگریزی، زبدۂ نوآبانِ عظیم الشان، مشیر خاصِ حضور فیض معمور بادشاہ کیوان بارگاہِ انگلستان، اشرف الاشراف مارکویس ولزلی، گورنر جنرل بہادر ناظمِ ممالکِ محروسۂ سرکار کمپنی انگریز بہادر، و میر اعظمِ عساکر بادشاہی و سرکار کمپنی متعلقۂ کشور ہند، فدویِ شاہ عالم بادشاہ غازی۔ عہد دولت میں اس عالی جناب کے ازبسکہ آرام اور چین ہر ایک شخص کے نصیب ہے، اور عزو وقار اہل علم کے قریب ہے، موافق حکم اس صاحبِ والا مناقب کے، کہ نام نامی اور اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس ہیچدان نے یہ تذکرہ لکھا، اور نام اس کا، بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے، **گلشن ہند** رکھا۔

اگرچہ احتیاج تاریخ کے نظم کرنے کی نہ تھی، کس واسطے کہ نثر میں سنہ ہجری اور عیسوی دونوں کی کیفیت لکھی ہے، اور علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاید یہی سمجھ کر گلزار ابراہیم میں تاریخ نظم سے چشم پوشی کی ہے۔ لیکن یہ نہ چاہئے، کیونکہ بہ نسبت نثر کے نظم پر ہر ایک شخص کان دھرتا ہے، اور حافظہ اس کو بہت جلد قبول کرتا ہے، تعجب کیا ہے کہ اس کا اشتہار ہو، اور اہل سخن کی زبان پر اس کی تکرار رہو، تو جس کو سنی سنائی بھی یہ تاریخ یاد ہو گی، اس کو بن دیکھے اس تذکرہ کے معلوم اس کی بنیاد ہو گی۔ بارہا صفات کے اشتہار سے ذات کو شہرت ہوئی ہے۔ اس فائدہ کے واسطے تاریخ

نظم اس کی اس طور پر لکھی گئی ہے۔ قطعہ

ہر ایک گل ہمیشہ بہار، اس حدیقہ کا	کہتا ہے یوں خزاں سے کہ تو کیا پلشت ہے
حیراں پھریں ہیں بے سر و پا بہمن اور دے	تاریخ اس کی حسب کے "رشکِ بہشت" ہے ۱۲۱۵ھ ۱۸۰۱ء

گلگشت کرنے والوں سے چمنستان نازک خیالی کے پوشیدہ نہ رہے، کہ اس نخلبند حدیقۂ بے استعدادی نے حسب الارشاد صاحب عالی شان مرقوم الصدر کے گلشن ہند کی دو جلدیں کی ہیں۔ جلد اوّل یہ جو تحریر کی جاتی ہے، اس میں عرش پروازیاں سلاطین نامدار کی، اور گوہر باریاں وزرائے والا تبار کی، اور خوش استعدادیاں اُمرائے عالی مقدار کی، اور سخن تراشیاں شعرائے صاحب وقار کی، جو کہ نام آور اور صاحب دیوان تھے، بیان کی گئی ہیں۔ اور جلد دوم میں مذکور کئے گئے ہیں شعرائے گم نام وغیرہ مشہور، یا وہ نو مشق کہ ہنوز نہیں تمام کر چکے ہیں کہانی شمع و پروانہ اور گل و بلبل کی۔ توفیق اس کتاب کی تمامی میں اُس مرجع کل سے چاہتا ہوں، کہ جس کی طرف رجوع ہے جزو کل کی۔ جل جلالہ وعم نوالہ۔

باب الف

۱۔ آفتاب

آفتاب تخلص، نور نیر جہانبانی، مہر سپہر صاحب قرانی شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی شاہزادگی میں گوہر صدفِ سلطنت کا نام عالی گوہر تھا۔ اُسی ایام میں عماد الملک کے خوف سے دلی سے نکلے، اور بعد بہت آوارگی کے نجیب خاں کے یہاں، کہ سردار قوم افغان کا تھا اور نجیب الدولہ خطاب رکھتا تھا، منتظرِ عنایتِ الٰہی کے ہو کر ٹھیرے۔ اس میں بعد ایک مدت کے محمد قلی خاں، بھتیجے نواب صفدر جنگ کو، کہ ناظم صوبۂ الہ آباد کا تھا، حوصلہ بنگالہ کی تسخیر کا دامن گیر ہوا، مشورے سے نواب شجاع الدولہ کے، کہ وہ باطن میں محمد قلی خاں کے برباد کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، خانِ مذکور نے شاہزادے کو نجیب خاں کے ہاتھ سے بلوا کے، اور وسیلہ عزم کا ٹھیرا کے، آپ مع

فوج کے رکاب سعادت میں داخل ہوئے، اور الہ آباد سے کوچ کر کے قریب عظیم آباد کے آپڑے اب آگے رام نرائن، عظیم آباد کے نائب نظامت، کا بے حواس ہو کر محمد قلی خاں کی معرفت حضور میں شاہزادے کے حاضر ہونا مشہور ہے، اور پھر بگڑ کے چند مدت قلعہ میں عظیم آباد کے بند ہو کر لڑنا، یہ بھی تواریخ بینوں کی نگاہ سے نہیں مستور ہے۔

ابھی محمد قلی خاں قلعے کو لگے ہی ہوئے تھے، کہ اس میں بعد ایک چند روز کے شہرۂ جعفر علی خاں اور میرن کی آمد آمد کا واسطے رام نرائن کی کمک کے مع کرنیل کلف بہادر ثابت جنگ کے مشرق کی طرف سے، ہوا۔ محمد قلی خاں نے اُن کی لڑائی سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت اپنے بیچ میں نہ پا کے، پیش از اُن کے داخل ہونے کے، کوچ بنارس کی طرف کیا۔ اور شاہزادہ عالی تبار عالی گوہر نے، کرم نام سی کی ندی[۵۱] سے، کہ صوبہ عظیم آباد کی سرحد میں ہے، عبور کر کے تھوڑی دُور گئے تھے، کہ باپ کے مارے جانے کا احوال اس طور سے سُنا، کہ مہدی قلی خاں کشمیری، علی قلی خاں کے بھائی نے، کہ رفیق عماد الملک کا تھا، حسب الارشاد اپنے آقا کے حضور اعلیٰ میں عرض کی کہ ”ایک فقیر بہت بڑا صاحب کمال فیروز شاہ کے کوٹلہ میں آ کے اُترا ہے، حضرت کو ملاقات اس سے کرنی ضرور ہے“ حضرت بیچارے اجل گرفتہ، حکم میں تو عماد الملک کے تھے ہی، اپنے پاؤں سے آپ قبر میں تشریف لے گئے۔ وہاں فقیر کہاں تھا، کئی ایک خونخوار جفا کار بے شرم اور بے رحم اُس حجرے میں بٹھا رکھے تھے، جاتے ہی اس بے گناہ کو پیش قبضوں سے مار کر لاش کو اوپر سے ریتی کی طرف کر دیا۔ شاہزادے نے سُنتے ہی اس خبر کے، کھتولے میں پہنچ کر، موافق ضابطۂ خاندانِ بابریہ کے ۱۱۷۳ھ گیارہ سو تہتر ہجری میں القاب ”شاہ عالم“، کے ساتھ تختِ سلطنت پر جلوس فرمایا۔ اور قلمدانِ وزارت کا مع خلعت جلد نواب شجاع الدولہ کے واسطے بھجوایا۔ ساتھ ہی اس کے خلعت امیر الامرائی کا، کہ عبارت میر بخشی گری سے ہے،

---

۵۱ یعنی اس ندی سے جس کا نام کرم تھا!

نجیب الدولہ کے لئے روانہ ہوا۔ اور نواب منیر الدولہ نے اُسی وقت موافق ارشاد کے ایلچی گری
کے طور پر ابدالی کی طرف کوچ کیا۔ اتنے میں کامگار خاں پانچ چھ ہزار سوار سے، اور دلیر خاں
اصالت خاں اپنی تمام جمعیت سے حاضر ہو کر، اقرار جانفشانی کے ساتھ داخل دائرۂ دولت
کے ہوئے۔ چنانچہ کامگار خاں نے اخراجات ضروری کا اپنا ذمہ کیا، اور زمینداروں سے اتنے
ہی عرصے میں، جس جس ڈھب سے بنا، کچھ کچھ رُپیا بھی لیا۔ تجویز یہ ٹھہری کہ میرن کے آنے سے آگے
ہی رام نرائن سے لڑ لیجئے، اور خدا فضل کرے، تو قلعے عظیم آباد کے عمل کیجئے۔ بادشاہ کو بھی یہ مشورہ
پسند آیا، اور اُسی وقت پیش خیمے کے کوچ کو حکم فرمایا۔ کامگار خاں اور دلیر خاں متصل رام نرائن
کے لشکر کے، کہ دیو ہانڈی کے کنارے پر پڑا تھا، آپڑے۔ اور بعد کئی دن کے میدان جنگ آراستہ
کر کے کمال جانفشانی اور سر فروشی کے ساتھ لڑے۔

سب سے پہلے دلیر خاں اور اصالت خاں نے گھوڑے چلائے، اور نہایت بہادری سے
رام نرائن کی فوج میں در آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ غول ان کا نشانہ تھا چھرّوں کی مار کا، اور ہدف تھا
بندوقوں کی باڑھ کا، بجلی کی طرح کڑک کر ہر ایک اژدہا توپ کا سا گرم آتش فشانی تھا، اور گولیوں
کی بارش کے ساون بھادوں کا مینہ شرمندگی سے پانی پانی تھا۔ اس میں بندوقوں کی مار سے
نشان[1] کے ہاتھی کا منہ پھر گیا۔ کسی نے دلیر خاں سے پکار کر کہا کہ "نشان کا ہاتھی پھر کھڑا ہوا"،
فرمایا "کیا ہوا، ہاتھی پھرا، اور گو کہ آسمان بھی پھرے دلیر خاں تو نہیں پھرا"۔ یہ کہ کے دونوں بھائیوں
نے کود کے گھوڑوں سے ایک تین سو جوانوں سے، کہ وہ رفیق ان کے تھے، ایسی ہی جانبازی
کی کہ ساری زمین ان کی لاشوں سے بھر دی، اور تمام فوج رام نرائن کی تلے اوپر کر دی، خاطر خواہ
دلاوری اور بہادری سے دل بھر کے، شجاعت اور تہوّر کا حق ادا کر کے، دونوں بھائیوں نے مع
رفیقوں کے جان شیریں نثار کی، لیکن رام نرائن کی فوج میں بھی باقی نہ رہی حلاوت گفتار کی۔

---

[1] یعنی وہ ہاتھی جس پر نشان سلطنت تھا ۱۲

اس میں توپ اور بندوق تو بند ہو ہی گئی تھی، کامگار خاں مع اپنی فوج کے جو ایک طرف سے بیٹھا، تو برابر رام نرائن کے جا نکلا۔ لوگ رام نرائن کے، از بسکہ دلیر خاں کی لڑائی کھائے ہوئے تھے، دوبارہ کامگار خاں کے مقابلے کی طاقت نہ لا کے پسپا ہوئے۔ رام نرائن نے مقدمہ بے ڈول دیکھا، عین لڑائی میں کپتان کاگری صاحب سے کہلا بھیجا کہ آدھے لوگ اپنے میری کمک کو بھیجئے۔ کپتان مذکور نے موافق حکم نائب نظامت کے اپنی فوج کے دو حصے کئے، اور آدھے آدمی اِدھر بھیج دیئے۔ لیکن لوگ ان کے بھی تو لڑائی کی محنت اُٹھا چکے تھے، اور جس قدر چاہئے تھا جی لڑا چکے تھے، کچھ کام بن نہ آیا، اور کسی طرح سے بندوبست نے لڑائی کے انتظام نہ پایا۔ چنانچہ کامگار خاں نے گھوڑا رام نرائن کے ہاتھی سے ملا دیا، اور اتنے تیر اور نیزے مارے کہ اپنی دانست میں اُنہوں نے مار لیا، لیکن اس مدبر نے زخمی ہو کر حوضی میں لپٹ جانے کو غنیمت جانا، اور تختوں کی آڑ کو وسیلہ زندگانی کا گردانا۔ غرض لڑائی بگڑ گئی، بہت سے لوگ رام نرائن کے ساتھ کے مارے گئے، اور کچھ تھوڑے سے لوگ بھاگ بھی بچارے گئے۔ مرلی دھر مع رحیم خاں اور غلام شاہ کے، کہ ہراول فوج کے تھے، کامگار خاں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے۔ احمد خاں قریشی اور مراد خاں، بیٹا بہرام خاں بلوچ کا، بھاگ کے رام نرائن کے شریک، عظیم آباد کی طرف قدم گزار ہوئے۔ شاہ عالم بادشاہ غازی نے فتح اور نصرت کے ساتھ کھیت پر ڈیرا کرنے کا حکم دیا، اور بھاگے ہوؤں کا پیچھا مطلق نہ کیا۔ اب آگے بیان ساتھ تفصیل کے موجب طول کلام کا ہے +

مختصر یہ کہ آج کے دن تک، کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، اور جلوس مبارک کو سنہ بیالیسواں ۴۲ ہے، وہ اورنگ نشینِ بارگاہِ جاہ و جلال تختِ سلطنت پر ساتھ عیش و نشاط کے حکمراں ہے +

سنہ تیسویں ہیں عہد سلطنت کے، منظور علی خاں ناظر کی بے بصیرتی سے شیخ غلام قادر خاں

زہیلے نے جو کورنمکی کی ہے مفصل بیان اِس کا غضب ہے، اور نہایت ترک ادب ہے، لیکن حضرت نے خود اپنی زبان بلاغت بیان سے اس روداد کو اس تفصیل کے ساتھ نظم کیا ہے، کہ اَور کسی بندۂ آستان دولت کی کیا مجال تھی کہ اس واردات کو اس بے ادبی سے زبان تک لاتا۔ ازبسکہ وہ غزل فارسی ہے، داخل کرنا اس کا بیچ کتاب کے خلاف آئین نثرِ ہندی کے معلوم ہوا، اس واسطے تیمّناً و تبرّکاً اس غزل کو حاشئے پر کتاب کے لکھا ہے، اور ترجمہ اس کا لفظاً باللفظ کر کے اس طرح داخل کتاب کیا ہے **نظم**

حادثے کی اُٹھی آندھی جو مری خواری کو — دم میں برباد کیا میری جہانداری کو

لہ

صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواریِ ما — داد برباد سر و برگ جہان داریِ ما

آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودیم — بُرد در شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما

چشمِ ما کندہ شد از دستِ فلک بہتر شد — تا نہ بینم کہ کند غیر جہان داریِ ما

داد افغاں بچۂ شوکتِ شاہی بر باد — کیست جز ذاتِ مبرّا کہ کند یاریِ ما

بود جا نکاہ زر و مالِ جہاں ہمچوں مرض — دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریِ ما

کردہ بودیم گنا ہے کہ سزا بش دیدیم — ہمت مصروف کہ بخشند گنہگاریِ ما

کردہ سی[۳۰] سال نظارت کہ مراداد بباد — زود تر یافتہ پاداشِ ستمگاریِ ما

عہد و پیماں بہ میاں داد و نمودند دغا — مخلصاں خوب نمودند وفاداریِ ما

شیر دادم افعی بچۂ را پروردم — عاقبت گشت مجوّز بہ گرفتاریِ ما

حق طفلاں کہ بہ سی سال فراہم کردیم — کردہ تاراج و نمودند سبک باریِ ما

قومِ مغلیّہ و افغاں ہمہ بازی دادند — بسکہ گشتند مجوّز بہ گرفتاریِ ما

ایں گدا زادۂ ہمداں کہ بہ دوزخ برود — بانیٔ جور و ستم شد بہ دل افگاریِ ما

گل محمد کہ زمروان بہ شرارت کم نیست — چہ قدر کرد وکالت پئے آزاریِ ما

نامراد و سلیمان و بدل بیگِ لعیں — ہر سہ بستند کمر بہرِ گرفتاریِ ما

بس کہ خورشید کو لازم ہے طلوع اور غروب — شام یوں پھولی غرض میری سیہ کاری کو
آنکھیں نکلیں، تو ہوا خوب کہ دیکھونگا نہ میں — غیر کے قبضے میں اورنگ جہانداری کو
مملکت کا بھی خیال ایک مرض تھا جانکاہ — گردشِ چرخ نے کھویا مری بیماری کو
کی اس افغاں بچے نے شوکتِ شاہی برباد — کون پہنچے گا خدا[1] چھٹے مری اب یاری کو
جو کئے تھے گنہ اُن سب کی سزا دیکھی ہیں — شاید اب پوچھیں نہ وہاں میری گنہگاری کو
جو تھا بتیس برس سے مرے گھر کا ناظر — پہلے حکم اُس نے دیا میری دل آزاری کو
بے گناہی نے مری اُس ستم ایجاد کے تئیں — جلد پہنچایا مکافاتِ ستمگاری کو
حقِ طفلاں جو ہوا تیس برس میں تھا جمع — مار کر لے گئے یاں چھوڑ[2] سنگ باری کو
قومِ افغان و مغل سب نے مجھے بازی دی — رکھا ہر اک نے روا میری گرفتاری کو
عہد و پیمان کئے اس میں، بھلا حقِ نمک — ان سے سیکھے کوئی آئینِ وفاداری کو
تھا جس افغاں بچے کو دودھ پلا کر پالا — بدلے اس حق کے وہ آیا میری خونخواری کو
نازنیں میری ہمدم جو تھیں یاں ایک نہیں — جز مبارک محل اس میری پرستاری کو
آصف الدولہ اور انگریز ہیں میرے دل سوز — کیا عجب آویں اگر میری مددگاری کو
مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند کے ہاتھ — ہوگی بے رونقی اس طرزِ جفا کاری کو

تضمین

شاہِ تیمور کہ دارد سرِ نسبت با من — زود باشد کہ بیاید بہ مددگاریِ ما۔
مادھوجی سیندھیا فرزندِ جگر بندِ من ست — ہست مصروفِ تلافیِ ستمگاریِ ما
آصف الدولہ و انگریز کہ دستورِ من اند — چہ عجب گر بنمایند مددگاریِ ما
راجہ و راو زمیندار امیر و چہ فقیہ — حیف باشد کہ نہ سازند بہ غمخواریِ ما
نازنینانِ پری چہرہ کہ ہمدم بودند — نیست جز محل مبارک بہ پرستاریِ ما
گرچہ ما از فلک امروز حوادث دیدیم — باز فرداد ہد ایزد بسر سرداریِ ما

[1] یعنی سوائے خدا کے ۱۲ [2] یعنی یہاں صرف سنگساری اور تہیدستی چھوڑ گئے ۱۲

کوئی پہنچا دو خبر حال کی میرے، کہ نظام
شاہِ تیمور سے ہے اک سرِ نسبت مجھ کو
راجہ و راو زمیندار امیر اور فقیر
آفتاب آج فلک نے کیا گر بے سروپا

شاید آ نکلے محبت کے سبب خبرداری کو
دور کیا ہے جو کرے دور دل آزاری کو
چاہیئے سمجھے سعادت میری غمخواری کو
بخشے گا کل تجھے حق پھر تری سرداری کو

حضرت جہاں پناہ کے مزاج مبارک کو نہایت نظم کی طرف التفات ہے، اور بیشتر شغل اشعار میں کٹتی اوقات ہے۔ ان شعروں کو اُس جناب کی طرف منسوب کرتے ہیں +

کیجیے ہمدم بھلا کیوں کر نہ شکوہ یار کا۔
خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اُس نے آہ
صاف کل آنکھیں تری کہتی تھیں عاشق سے پکار
خون ہووے گا گلوں کا دیکھنا ہر گز صبا
زلف تیری دیکھ کے زاہد رگِ جاں سے بنا
کب ترے عشاق بیٹھیں حشر میں طوبیٰ تلے
دیکھ کر کل نبض میری یوں لگا کہنے طبیب
صرف کعبہ میں نہ کر اوقات کو ضائع تو شیخ

ہم تو بندے اُس کے ہوں، وہ یار ہو اغیار کا
ہو جیو یارب بھلا اس چشم آتشبار کا
کر سکے عیسیٰ مداوا اپنے کب بیمار کا
نام مت لینا چمن میں اُس بت خونخوار کا
جانتا ہے گا سعادت باندھنا زنار کا۔
یاد آوے دل میں جب سایہ تری دیوار کا
کوئی بھی، جانبر ہوا بیمار اس آزار کا
ڈھونڈھ جا کر ہر طرف نقشِ قدم دلدار کا

اس قدر افسردہ دل کیوں ان دنوں ہے آفتاب
دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو تنگ دل گلزار کا۔

صبح اُٹھ جام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

ولہ

شب دل آرام سے گذرتی ہے
اب تو آرام سے گذرتی ہے

۲ - آصفؔ

آصف تخلص، نور کوکب ہمت اور شجاعت کا، خورشید آسمان مروت اور سخاوت

کا، نواب آصف الدولہ وزیر الممالک آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ، خلف نواب
شجاع الدولہ مغفور کا ہے، اور پوتا نواب ابو منصور خاں صفدر جنگ کا۔ بعد وفات شجاع الدولہ
کے کہ گیارہ سو ستاسی ۱۱۸۷ سنہ ہجری تھے، اور شاہ جہاں پناہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے
عہد سلطنت کو پندرھواں سنہ تھا، بلدۂ فیض آباد میں، کہ قدیم نام اس کا بنگلا ہے، مسند
وزارت کو زینت اس عالی تبار نے بخشی ہے۔ ازبسکہ رسم کہن ہے کہ بادشاہ اور وزیر
واسطے نام کے، عہد حکومت اپنے میں، نئے شہر کے آباد کرنے کی تلاش کرتے ہیں، اور
وہاں مقرر بود و باش کرتے ہیں۔ بعد چندے ہی اس آب و رنگ گلشن وزارت نے بنگلے
سے کوچ کر کے خارستان لکھنؤ کو بہار قدوم سے اپنے رشک شگوفہ زار کشمیر کا کیا۔ لکھنؤ
کے تن بے جان میں گویا جان آئی، اور چشم بے نور نے بصارت پائی۔ پھر تو آبادی پر شہر
کے عرصۂ زمین کا تنگ تھا، اور معموری کو اس خراب آباد کی تشبیہ سے ہفت اقلیم کی ننگ
تھا۔ بسکہ اس بلند نظر کا اہل کمال کی طرف میلانِ خاطر تھا، ایک ایک کمال کا ہزار ہا
آدمی وہاں حاضر تھا۔ عمارت کی تعمیر پر طبیعت نہایت مصروف تھی، اور خواہش شکار
کی مزاج سے بشدت مالوف تھی۔ ہر روز لازم تھا ایک عمارتِ تازہ کی بنا کا دھرنا، اور ہر
سال عین واجب تھا واسطے شکار کے دو مرتبے سفر کرنا۔ بے مبالغہ ہے کہ ہزاروں شیر مانند
بکریوں کے مارنے میں آئے، یہاں تک کہ اُن کی کھالوں کے منعہ و خیمے عالی شان بنوائے
پہلی ہی گولی اس کے ہاتھ کی گینڈے اور ارنے کو تھا پیغام اجل کا، اور بڑے دانت ہونے
ہاتھی کے بس یہی اُس کے واسطے تھا دام اجل کا، مستک پر فیلِ مست کی جب اس کا تیر
بیٹھا، سوفار کا باہر نام نہ تھا۔ پہاڑ کو تنکے سے ٹالنا اس کے آگے کچھ کام نہ تھا۔ جنگلی ہاتھی
دنتیلے اتنے مارے کہ آج دولت خانہ میں ایک عمارت عالی شان ہاتھی دانت کی موجود ہے
جس کے ستون اور کڑیوں میں نام کو کہیں لکڑی کا نہیں وجود ہے۔ شجاعت کے سوائے
سخاوت پر جب طبیعت آئی تو ہمت حاتم کی دل سے خلائق کے بھلائی۔ ایک دن میں

لاکھ روپیہ سے شریف مکہ کی خدمتگذاری کی، اور پانچ لاکھ روپے خرچ کر کے نجف اشرف میں نہر آصفی جاری کی۔ فیاض ایسا کہ جو کوئی سامنے پھرے گیا خالی نہیں پھرا ہے۔ بے مبالغہ ہے کہ خاک کی مٹھی کو اکثر اکسیر کی قیمت میں لیا ہے۔ اس میں کوئی گستاخ اگر اس کی قباحت زبان پر لایا، تو وہیں بے مزہ ہو کر اس سے فرمایا کہ "اتنی مروت کرنی اس شخص سے ہم نے مدت سے اپنے دل میں تھی ٹھیرائی، یہ چٹکی خاک کی جو اس سے لی یہ مفت میں پائی" غرض جو کچھ چاہیے سب کمالوں کی جامعیت تھی۔ افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی۔ نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ فقط سیر اور شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لایق اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا چھبیس ۲۶ برس گل اس مربع نشینِ مسندِ وزارت نے حکمرانی کی، اور چمن گیتی میں مانندِ گلِ خورشید کے محتاجوں پر زرفشانی کی۔ آخرالامر از بسکہ بیچ گلشن دنیا کے بہار اور خزاں آپس میں دست و گریباں ہیں، بیماری سے استسقی کی ۱۲۱۲ سنہ بارہ سو بارہ ہجری میں، کہ سلطنت کو شاہ عالم بادشاہ غازی کے چالیسواں سنہ تھا، اٹھائیسویں تاریخ ربیع الاول کی، پہر ڈیڑھ ایک دن رہے، حکومت عارضی کو ملک فنا کی چھوڑ کر کارفرمائی اقلیم بقا کی اختیار کی۔ راقم آثم صغر سن سے ملازم ہوں میں اس آستانۂ دولت سے مع رسالہ سرفراز تھا، اور افراطِ عنایت اور الطاف سے اس کے ہم چشموں میں اپنے مورد امتیاز تھا۔ اس شمع شبستان وزارت کی تاریخ وفات کا شعلہ اس جگر کباب کے گلخنِ طبع سے یوں آتش فشاں ہوا ہے۔ **قطعہ**

آصف الدولہ جب جہاں سے گیا	اک جہاں بے دل، و داغ ہوا۔
جامِ عمر اس کا بھرتے ہی لبریز	خلق کا[۱] عیش کا ایاغ ہوا
دشمنوں کا دل آتشِ غم سے	دوستوں سے زیادہ داغ ہوا
سالِ تاریخ کا خیال کسے	خشک شعر و سخن کا باغ ہوا

۱؎ یعنی خلق کے عیش کا ایاغ لبریز ہوا ۱۲

بوے یوں دور کرکے پائے عناد
آج گل ہند کا چراغ ہوا

یہ اشعار اُس عالی جناب کے مشہور ہیں +

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے — ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے
تیرے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح — ایسے بیٹھے کہ پھر نہ واں سے گئے
شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم — سنبو اک دن کہ جسم و جاں سے گئے
عشق! ہاتوں سے تیرے کیا کہئے — نام سے گذرے اور نشاں سے گئے
ایک دن ہم نے یار سے جو کہا — اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے

ہنس کے بولا کہ "سنتا ہے آصف
یوں ہی کہہ کہہ کے لاکھوں یاں سے گئے"

دل ہمارا خانۂ اللہ گر مشہور تھا	ولہ	سو بتوں کے عشق میں اب وہ بھی بتخانہ ہوا
آباد ملکِ دل وہ یارو کہاں رہے گا	ولہ	جس جا یہ درد و غم کا نت کاروان رہیگا
آصف نہ چھُٹے عشقِ بتاں سے دل ہمارے	ولہ	سو بار اگر پھر بھی بناویں اسے گھڑ کر
شوخیِ چشم کی شہرت کو تری سُن سُن کر	ولہ	شرم سے باغ میں نرگس نے چھپائیں آنکھیں
مرے دل کو زلفوں میں زنجیر کیجو	ولہ	یہ دیوانہ اپنا ہے تدبیر کیجو
مرے دل نے زلفوں میں مسکن کیا ہے		یہ مہماں ہے اے شانہ، توقیر کیجو
جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے	ولہ	آب سے آتش ہوئی کیوں کر ہم کیا جانئے
پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو	ولہ	میں ہوں، اور رات ہے، اور بسترِ تنہائی ہے
آصف نہ چھوڑ دستِ سخاوت کو زینہار	ولہ	لایا ہے کچھ نہ ساتھ نہ جائے گا تو لئے
یاں تلک داغِ محبت دل نے کھائے ہیں کہ بس	ولہ	سر سے پا تک ایک گویا صورتِ طاؤس ہے
ہزاروں مرے جیتے دیکھے تیرے بات کرنے سے	ولہ	لبِ معجز بیاں میں تیرے شاید آبِ حیواں ہے۔

۳- انجام

انجام تخلص، عمدۃ الملک خطاب، نواب امیر خاں نام، والد ماجد ان کے عمدۃ الملک نواب امیر خاں ہیں، کہ جو عالمگیر خلد مکان کے عہد سلطنت میں زینت بخش مسند امارت کے تھے۔ سلسلہ نسب شریف کا اس عالی خاندان کے میر میران نعمت الٰہی کو، کہ سلاطین صفویہ کے ساتھ نسبت اور ناتا رکھتے تھے، پہنچتا ہے۔ بزرگ ان کے ہمیشہ ایران میں صدر نشین تھے محفل عزو وقار کے، اور ہندوستان میں بھی ہمیشہ انیس وجلیس رہے ہیں سلاطین نامدار کے۔ اس عالی ددومان کو شاہ عالم پناہ محمد شاہ سے ایسی صحبت برآ ہوئی تھی، کہ رشک تھا ان کی سب ارکان دولت کو، اور اعیان مملکت کو، حسد تھا۔ لطیفہ گوئی کی طرف طبیعت ان کی نہایت مصروف تھی، اور خوش طبعی سے مزاج بہ شدت مالوف۔ گردش چشم کے سمجھنے میں زمانے کے اُستاد تھے، اور شیریں کلامی میں اپنے وقت کے فرہاد۔ موجد نازو انداز کی تہ داریوں کے، اور اختراع کرنے والے جنون کی جادو کاریوں کے۔ گانے میں دخل ایسا تھا، کہ اُستاد اس فن کے دم شاگردی کا مارتے تھے، اور ناد وبید کی باتوں میں بڑے بڑے گیانی ان کے آگے جی ہارتے تھے۔ بادشاہ کو ایسا اپنی طرف مصروف کر لیا تھا، کہ ایک دم کی جدائی ان کی جہاں پناہ کو شاق تھی، اور آٹھ پہر طبیعت ان کی طرف مشتاق تھی۔ لیکن موافقت ور اندازی سے بد گویوں کی آخر آخر مبدل بہ غبار خاطر ہوئی، اور خواہان جان نہ بباطن بلکہ بظاہر ہوئی۔ چنانچہ ۱۱۶۹ سنہ گیارہ سو اُنہتر ہجری میں ایک نمک حرام نے اُن ہی نوکروں میں سے انہیں کے عین صحن دولت خانہ میں بادشاہ کے قہر کیا، کہ اس روشن زبان کی زندگی کے چراغ کو ایک ہی جھوکے میں کٹاری کے بجھا دیا، اگرچہ اس نااہل کا بھی اُسی جگہ لگ گیا ٹھکانا لیکن افسوس ہے نواب امیر خاں کا مارے جانا۔ اکثر ارباب فہم کو گمان تھا کہ یہ اشارہ بادشاہ کا ہے اور امر جہاں پناہ کا ہے۔ جب اس نمک حرام کی لاش کو اُٹھوانے میں بادشاہ نے نہایت کرم

فرمایا، پھر تو عوام کو بھی اس گمان کا بے تامل یقین آیا +

اس عالی طبیعت کو پہیلی اور مکرنی کے کہنے میں مشق حد سے زیادہ تھی، اور اشعار فارسی اور ہندی میں بھی چنگی استعداد تھی۔ یہ اشعار اس ستودہ اطوار کے آویزہ گوش صغار و کبار ہیں +

کیوں بلایا بھیڑ میں کیا مجھ سے نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی

کل محیطِ عشق کے صدموں سے پائی تھی نجات
کشتیِ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی

ہر پری تمثال جوں آئینہ رکھتا تھا عزیز
ٹوٹتے ہی دل کے مجھ کو سخت حیرانی ہوئی

کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو
دوستداروں کی محبّت دشمنِ جانی ہوئی

نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے
"کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی"

ولہ

ٹک تو فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

منہ ترا تکتے ہیں سب تسلیم حُسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم

دل تو ہے داغِ غلامی سے تری طاؤس وار
سامنے قمری کے گو ہیں سرو ساں آزاد ہم

اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر مانندِ شرر جب کر چلے برباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاشِ محنت
شکر ہے، تڑپے نہ زیرِ خنجرِ جلاد ہم

۴۔ اُمید

اُمید تخلص، نام اصلی اس معدنِ کمالات کا مرزا محمد رضا ہے، رہنے والا ہمدان کا، ایّام شباب میں وطن سے غربت اختیار کر کے وارد اصفہان کا ہوا ہے، اور میرزا طاہر سے کہ وحید جن کا تخلص تھا، نسبت شاگردی کی درست کر کے کسب کمالوں کا کیا ہے۔ آخر سلطنت میں خلد مکان[۱] کے ہندوستان میں آیا، اور اول بادشاہت میں بہادر شاہ

[۱] یعنی اورنگ زیب عالمگیر ۱۲

کے خطاب قزلباش خاں کے ساتھ رتبہ منصب ہزاری کا پایا، لیکن اس پائے سے ہمیشہ اس ایام میں شکوہ مند رہا ہے، اور منصب ہزاری کے مضمون کو ایک بیت میں اس طرح سے موزون بھی کیا ہے[۱] +

مثل بلبل کے ہوں سدا نالاں
یہ مرا منصب ہزاری ہے

محمد معزالدین کے وقت میں کسی خدمت کی تقریب سے برہان پور کو گیا، اور صوبہ داری میں امیر الامرا سید حسین علی خاں کی اس خدمت سے تغیر ہو کر خجستہ بنیاد میں حاضر ہوا +

اس جگہ تھوڑا سا احوال مجمل سید حسین علی خاں کی امیر الامرائی کا، اور صوبہ داری دکن کی جلوہ فرمائی کا، بیان کرنا ضرور ہے، کس واسطے کہ تغیر ہونا قزلباش خاں کا بخوبی معلوم ہوگا۔ جب کہ ۱۱۳۲ھ گیارہ سو بتیس ہجری میں محمد فرخ سیر اور محمد معزالدین سے لڑائی ہوئی، تو سادات بارہ نے کمال جانفشانی کی، چنانچہ سید عبد اللہ خاں اور سید حسین علی خاں نے، مع اپنے بھانجے بھتیجوں اور رفیقوں کے، حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں، بہادر خاں کے بیٹے کو، مع اُن کے رفیقوں کے، شریک کر کے بالا جو کیا، تو زنجیر سے توپخانے کے گھوڑوں کو کدا کُدا کے مقابل ذوالفقار خاں کے، کہ بیٹا اسد خاں وزیر کا تھا، جا پہنچے، اور گود کود کے گھوڑوں پر سے جیسی چاہئے تھی جاں نثاری کی، اور داد مردانگی اور شجاعت کی دی۔ اس میں توپیں بند ہوئی گئیں تھیں، باقی فوج سے بھی تن دہی ہوئی۔ حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں، بیٹا بہادر خاں کا، یہ دونوں سردار مع اپنے رفیقوں کے بہادری کا حق ادا کر کے، کام آئے، اور سید حسین علی خاں چور ہو کر کھیت میں بیٹھ گئے۔ اتنے زخم اُٹھائے، بارے سادات کے سر لڑانے سے پانوں طرف ثانی کے اُٹھ گئے۔ جو موئے سو موئے، اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ محمد معزالدین نے اپنی صورت بدل کر راہ دلی کی لی، اور محمد فرخ سیر کو اللہ تعالیٰ نے سادات کی نمک حلالی سے سلطنت عطا کی۔

[۱] مثل بلبل ہمیشہ نالانم + ایں بود منصب ہزاری ما +

سید عبداللہ خاں، بھائی کو زخمی کھیت میں چھوڑ کر، فوج کا تعاقب کیے چلے گئے ہیں، اور بادشاہ بعد ایک ہفتہ کے داخل دلی میں ہوئے ہیں۔ اس جانبازی کے عوض میں بادشاہ نے سید عبداللہ خاں کو وزیر اعظم کیا، اور قطب الملک یار وفادار سید عبداللہ خاں بہادر ظفر جنگ خطاب دیا۔ اور سید حسین علی خاں کو میر بخشی ہونے کے سوا منصب ہفت ہزاری عنایت ہوا، اور امیر الامرا سید حسین علی خاں بہادر فیروز جنگ خطاب ملا۔ بعد اس فتح کے جو خدمتیں کہ ان سے ہوئی ہیں، اور جو نمک حلالیاں کہ انہوں نے کیں ہیں مفصل بیان اس کا موجب طول کلام کا ہے، اور کچھ متعلق بھی نہیں اس مقام کا ہے۔ غرض توجہ بادشاہ کی ازبسکہ ان پر حد سے زیادہ تھی، حاسدوں کو بس یہی عداوت کی بنیاد تھی۔ تھوڑے ہی سے دنوں میں بدگویوں نے ان کی طرف سے بادشاہ کے دل میں سیکڑوں شبہے ڈال دیئے، غضب تو یہ ہے کہ اس عقل مجسم نے حاسدوں کے کہنے سے بے تامل مان لئے۔ پھر تو دشمنوں نے تدبیر ان کے توڑنے کی یہ ٹھیرائی، کہ پہلے لازم دونوں بھائیوں میں ڈالنی جدائی۔ اس تقریب سے امیر الامرا سید حسین علی خاں کے واسطے تجویز صوبہ داری دکھن کی ہوئی، اور رخصت حضور سے ۱۱۲۷ گیارہ سو ستائیس ہجری میں اس مروت کے معدن کی ہوئی۔ ابھی دس کوس بھی دکن کی سمت کو نہیں تھی سواری گئی، کہ ساری ولی پکارتی تھی "جگ چھوٹا اور نرد ماری گئی"۔ قصہ مختصر بعد کتنے دنوں کے، اور طے کرنے منزلوں کے، جب نربدا سے عبور ہوا تو ایک فوج عالی شان لے کر واسطے لڑائی کے سامنے داؤد خاں ناظم برہان پور ہوا، کیونکہ فرمان بادشاہی معرفت خان دوراں خاں کے اس کو آگے ہی پہنچ چکا ہے، کہ دفعیہ بھی امیر الامرا سید حسین علی خاں کے اگر تجھ سے مقصور ہوگا، تو گنہگار حضور کا ہے۔ سبحان اللہ! یہ داؤد خاں وہی ہے، کہ اوائل سلطنت میں محمد فرخ سیر کے امیر الامرا نے اس کی جان بخشی کروائی ہے، اور احمد آباد گجرات سے اس کو باہر بھجوا کے سند صوبہ داری برہان پور کی حضور سے اس کے نام بھجوائی ہے۔ وہ حق احسان فراموش کر کے جان بخشی کے عوض میں خواہان جان ہوا۔

چنانچہ ۱۱۲۷ھ گیارہ سو ستائیس ہجری میں، گیارھویں تاریخ رمضان کی، لڑائی کا آراستہ میدان ہوا۔ بعد بہت سی خونریزی اور کشاکشی کے داؤد خاں نے بندوق کی گولی کھائی، بساط ہستی کی گنوائی، اور امیر الامرا فیروز جنگ نے ساتھ فتح اور فیروزی کے اورنگ آباد میں داخل ہو کر مسند حکومت کی آرایش فرمائی۔ اس حرکت سے کہ برہان پور کے ناظم سے ہوئی تھی، آتے ہی اہلِ خدمت برہان پور کے سب تغیر کیے۔ اس تقریب سے قزلباش خاں بھی معزول ہو کر حضور میں حاضر ہوئے۔ ازبسکہ سلیقہ علم مجلس کا اس مجموعۂ کمالات کو بہت بڑا تھا، اور مزاج دانی میں اُمرا کے بہ شدت دخل رکھتا تھا، طرز خدمت اس کی امیر الامرا کو نہایت پسند آئی، اور داروغگی حکومتِ کرناٹک کی واسطے قزلباش خاں کے قرار پائی۔ اس تقریب سے ارکاٹ کو گیا، اور ایک مدت بھر وہیں رہا۔ بعد زوال دولت سادات کے، کہ وہ قصہ مشہور ہے، اور یہاں کچھ بیان اس کا نہیں ضرور ہے، قزلباش خاں نے رفاقت مبارز خاں کی، کہ ناظم حیدر آباد کا تھا، اختیار کی۔

چنانچہ ۱۱۳۷ھ گیارہ سو سینتیس ہجری میں، جب نواب نظام الملک آصف جاہ سے اور مبارز خاں سے میدان میں شکر کھیڑی کے، کہ سات کوس اورنگ آباد سے ہے، لڑائی ہوئی، تو قزلباش خاں بھی ساتھ تھا۔ مبارز خاں تو صیادِ اجل کا نخچیر ہوا، اور قزلباش خاں دامِ ہستی میں پھنس کر دستگیر ہوئے۔ بعد کئی دن کے ایک غزل نواب کی تعریف میں، اور اپنے عذر تقصیر میں لکھ کر بھجوائی۔ بندش اس غزل کی نواب آصف جاہ کو پسند آئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں پھر تو ایسی موافقت آئی، اسی وقت بموجب حکم قید سے نجات ملی، اور جاگیر قدیم بدستور سابق بحال ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر تو ایسی موافقت آئی کہ قلعہ داری منی مرگ کی نواب نے عنایت فرمائی۔ یہ قلعہ ہے علاقہ میں کرناٹک کے، وہاں ہیرے کی کھان تھی۔ چنانچہ کشنا ایک ندی ہے، اس کے کنارے سے ہیرا نکال کے وہاں تراشتے ہیں۔ چند مدت اِس معدنِ معانی نے ہیرے کی کھان کی داروغگی میں اوقات نہایت

آب وتاب سے بسر کی، اور اسی عرصہ میں رخصت حج اور زیارت کی لی۔ بعد حاصل کرنے سعادت زیارت کے جو آیا، تو نواب آصف جاہ کو ویسا ہی توجہ اور عنایت کے ساتھ پایا۔ جب کہ ۱۱۵۰ء گیارہ سو پچاس ہجری میں نواب آصف جاہ حضور طلب ہوئے، اور شاہ جہان آباد آئے، تو قزلباش خاں بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ اس میں کچھ شورش مرہٹوں کی تنبیہ کے لئے مامور ہوئے، اور قزلباش خاں اس سفر میں فقط پاس رفاقت کر کے جدا ولی سے مجبور ہوئے میر غلام علی آزاد تخلص، سرو آزاد جو اُن کا تذکرہ ہے، اُس میں لکھتے ہیں، کہ جس ایام میں نواب آصف جاہ کو بھوپال کے سفر کا اتفاق ہوا، تو فقیر بھی عازم حج کا تھا۔ اس قافلے کے پہنچنے کو عنایاتِ الٰہی سے سمجھ کر چلنا راہ کا اور اُترنا منزلوں کا باہم اختیار کیا۔ چنانچہ قزلباش خاں سے مکرر اور متواتر ملاقاتیں اس سفر میں ہوئیں۔ عجیب مجمع کمالات نظر آیا۔ باوصف ولایت زائی کے ہندی راگوں کے گانے اور سمجھنے میں نہایت طبع چست اور فہم درست رکھتا تھا، اور خوش اختلاطی اور رنگین مزاجی میں بھی کوئی مقام اس سے نہیں چھوٹتا تھا۔ یہ لطیفہ اس کی زبانی ہے کہ "ایک دن میں نے کچھ شکایت زمانے کی نواب ذوالفقار خاں بیٹے نواب اسد خاں، وزیر جو تھے، اُن کے سامنے کی، سُن کر فرمانے لگے کہ "سچ ہے دنیا کو اُمید کے ساتھ بسر کرتے ہیں"۔ میں نے عرض کی کہ "اگر دنیا کو اُمید کے ساتھ بسر کرتے ہیں تو افسوس ہے آپ مجھ بغیر دنیا کو بسر کرتے ہیں، کہ میرا تخلص "اُمید" ہے"۔ غرض جب نواب آصف جاہ بھوپال میں پہنچے، تو فوج نے مرہٹے کی شدتیں کیں، اور لڑائیاں مکرر ہوئیں۔ اس میں نادر شاہ کے آنے کا غلغلہ ہندوستان کی طرف ہوا۔ نواب آصف جاہ نے اس ایام میں لڑائی کا طول دینا مناسب نہ سمجھ کے، ساتھ دارومدار کے مصلحتاً صلح کی، اور مع قزلباش خاں کے داخل شاہ جہان آباد میں ہوئے۔ آگے نادر شاہ کا آنا، اور دلی کا لوٹے جانا، مشہور ہے، یہاں کچھ بیان اس کا نہیں ضرور ہے۔ غرض جب والی ایران کا ایران کو گیا، اور شہر میں امن وامان ہوا، تو آصف جاہ حضور سے رخصت ہو کر پھر دکن کو سدھارے، اور قزلباش خاں نوکری

چھوڑ کر کمر کھول کر بیٹھ رہے، دلّی کی محبت کے مارے چند روز اور بھی ساتھ عیش و نشاط کے
دیکھا جلوہ دم اور قدم کا، آخر ۱۱۵۹ھ گیارہ سو انسٹھ ہجری میں سکتے کی بیماری سے لاچار
کیا سفر ملک عدم کا۔ قریب آٹھ ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس بلند طبع نے فکر کی ہے،
اور ہندی میں گاہ گاہ بطور اختلاط کے کبھی کوئی غزل کہی ہے۔ یہ اشعار اُس ستودہ اطوار
کے ہیں +

با نازِ حور و حُسنِ ملک، جلوۂ پری۔
رفتم بہ پیش و گفتم "جانم فدائے تست"
ایسی نہ سیتا، اور نہ بھوانی نہ رادھکا
گفتم کہ "تیرے پانوں پڑوں اور بلا لیم"

باہمن (برہمن) کی بیٹی ایک مری آنکھوں میں کھڑی[1]
غصّہ کیا، دگالی دیا، اور دگر (یعنی پھر) لڑی
کرتار[2] نے نہ ایسی کوئی دوسری گھڑی
گفتا کہ "ڈاڑھی[3] جار مغل تجھ کو کیا پڑی"

گفتم "اُمیدِ وصل پہ ہم تیرے جیتا ہوں"
گفتا کہ "چل پرے دئی مارے تجھے مری"

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
دل ہمارا اسے کرتا ہے رات
دردِ دل اس سے جو ہم نے نہ کہا
دہر میں پاسِ نفس لازم ہے

ولہ
در و دیوار سے اب صحبت ہے
غیب سے کے جو ہر شب صحبت ہے
ایسی حاصل ہوئی کب صحبت ہے
شیشہ و سنگ یہ سب صحبت ہے

دستِ اغیار ہے زیرِ سرِ یار
آج اُمید کو ڈھب[4] صحبت ہے

۱ اور تذکروں میں کھڑی کی بجائے "پڑی" ہے جو "در نظرم افتاد" کا ترجمہ ہے ۱۲
۲ کرتار یعنی خدا ۱۲
۳ یعنی ریش سوختہ ۱۲
۴ یعنی کُڈھب ۱۲

۵- آرزو

آرزو تخلص ہے، سراج الدین علی خاں نام، متوطن اکبر آباد کے۔ باپ کی طرف سے سلسلہ اس بزرگوار کا شیخ کمال الدین، بھانجے سے شیخ نصیر الدین کے، کہ چراغ دہلوی جنکا لقب تھا، ملتا ہے، اور ماں کی طرف سے شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری کو پہنچتا ہے۔ چھوٹی عمر سے طبیعت اس بزرگ زادے کی پڑھنے لکھنے کی طرف مصروف تھی۔ چنانچہ چودھویں برس شعر کہنا شروع کیا، اور چوبیس برس کی عمر تک جتنی کتابیں درسی اور ضروری تھیں پڑھ چکا، فاضلوں سے عصر کے جس قدر کہ فائدہ چاہیئے تھا اُٹھایا اور مرتبہ کو استعداد کے نہایت بلندی کو پہنچایا۔ بعد تحصیل علم کے بادشاہی منصب داروں میں داخل ہو کر وطن سے دور ہوا، یعنی اوائلِ سلطنت میں محمد فرخ سیر کی گوالیر کی خدمتوں میں سے ایک خدمت کے ساتھ مامور ہوا۔ سنہ ۱۱۳۲ھ گیارہ سو بتیس ہجری تھی کہ دار الخلافہ ہندوستان میں آیا، اور زور شور شاعری کا زباں دانوں کو وہاں کے دکھایا۔ چنانچہ ۱۱۴۷ھ گیارہ سو سینتالیس ہجری میں، کہ شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمۃ ایران سے شاہ جہان آباد میں تشریف لائے، تو اُس یگانۂ روزگار کی ملاقات کو شاہ و گدا سب آئے۔ سراج الدین علی خاں سے جس قدر اخلاق کہ مناسب اُن کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی، اور ناحق اپنی طبیعت اُن سے محجوب کی۔ آزردہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر سقیم ٹھیرائے۔ چنانچہ وہ سب اعتراض جمع کر کے ایک رسالہ لکھا ہے، اور نام اُس کا "تنبیہ الغافلین" رکھا ہے[1]۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے، نہیں تو صاف نزاع معلوم

---

[1] مولوی امام بخش صہبائی نے ایک رسالہ "قول فیصل" نام لکھا ہے، جس میں خان آرزو کے اکثر اعتراضات کے جواب دئیے ہیں ۱۲

ہوتی ہے، جب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے۔ غرض شاعر زبردست اور صاحب استعداد تھا، اکثر مضمون میں سے مضمون کو کرتا ایجاد تھا۔ لطیفہ گوئی اور ظرافت میں بہ شدت مشّاق، خوش طبعی اور رنگین مزاجی میں شہرۂ آفاق تھا۔ اگرچہ سررشتہ ملاقات کا ان کو ایک جہان سے تھا، لیکن توسّل امورات دنیا میں نواب اسحٰق خاں سے تھا۔ بعد خرابی کے شاہ جہان آباد کے نواب سالار جنگ کے ایما سے لکھنؤ میں آئے، لیکن فلک نیرنگ باز نے بیرنگی ہی کے رنگ دکھائے۔ چنانچہ لکھنؤ میں وصال ہوا ہے، اور لاش کو اُن کی، بموجب اُن کی وصیت کے، نواب سالار جنگ نے بعد سپردگی شاہ جہان آباد کو بھجوا دیا ہے۔ بہت سی کتابیں اس ماہر فنون نے تالیف کی ہیں۔ اتنی تو نگاہ سے راقم عاصی کے بھی گزرے ہیں:۔ فن معانی میں ایک رسالہ لکھا ہے کہ نام اُس کا "موہبتِ عظمیٰ"[1] ہے۔ اور فن بیان میں ایک رسالہ اس کی تصنیف سے مشہور "عطیۂ کبریٰ" ہے۔ اور ایک فرہنگ لکھی ہے، کہ نام اُس کا "سراج اللغت" ہے، بطرز برہان قاطع کے۔ اور سوائے اس کے حال کی اصطلاحات میں ایک نسخہ تالیف کیا ہے، کہ مشہور ہے "چراغ ہدایت" کر کے۔ شرح اسکندر نامہ کی اور قصائد عرفی کی لکھی ہے۔ اور گلستاں کی شرح، کہ نام اُس کا "خیابان" ہے، تالیف کی ہے۔ ایک تذکرہ[2] فارسی گویوں کا نہایت لطیفوں کے ساتھ لکھا ہے۔ سوائے اس کے اَور بھی بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ ۱۱۶۹ھ گیارہ سو اُنہتر ہجری میں اس فراغ پڑھنے والے مدرسہ زندگی کے نے کتاب ہستی کو گردان کے اُستاد اجل سے درس فنا کا پڑھا۔ قریب تیس ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس کو کہنے کا اتفاق ہوا ہے، اور ریختہ کا قصد گاہ گاہ بطریق تفنن کے کیا ہے۔ یہ اشعار ہندی طبع زاد اُس کے مشہور ہیں۔

میخانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے جان کچھ تجھ پر اعتماد نہیں		زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے زندگانی کا کیا بھروسا ہے	
	ولہ		

[1] یہ رسالہ چھپ گیا ہے ۱۲ [2] اس تذکرے کا نام مجمع النفائس ہے ۱۲

آتا ہے صبح اُٹھ کے تیری برابری کو — کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
ولہ
دل ہارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک — کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیاگری کو
اس تند خو صنم سے ملنے لگا ہے جب سے — ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو
اپنی فسوں گری سے اب ہم تو ہار بیٹھے — بادِ صبا یہ کہنا اس دل ربا پری کو
اُب خواب میں ہم اُس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو"

فلک نے رنج تیرِ آہ سے میرے زبس کھینچا — لبوں تک دل سے شب نالے کو میں نے نیم رس کھینچا
ولہ
مرے شوخِ خراباتی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو — بہارِ حُسن کو دی آب اُس نے جب چرس کھینچا
رہا جوش بہار اس فصل گریوں ہی تو بلبل نے — چمن میں دستِ گلچیں سے عجب رنج اس برس کھینچا
کہا یوں صاحب محمل نے سُن کر سوز مجنوں کا — "تکلف کیا جو نالہ بے اثر مثلِ جرس کھینچا
نزاکت رشتۂ اُلفت کی دیکھو سانس دشمن کی
خبردار آرزو تک گرم گر تار نفس کھینچا

۶ - آبرو

آبرو تخلص، شاہ نجم الدین نام، ساکن شاہ جہان آباد - اولاد میں شیخ محمد غوث گوالیری کے تھے - سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ داران قریب ہیں - اور صاحب دیوان تھے زبان ریختہ کے - ترکیب میں بیشتر اشعار اُنہوں نے ایہام کے کہے ہیں، یعنی اکثر وہ الفاظِ شعر میں لائے ہیں، کہ جن لفظوں کے دو معنی ہیں، اگرچہ بامعنی یا لایعنی - محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے عہد سلطنت میں اُنہوں نے جہان فانی سے رحلت کی ہے - ان شعروں نے آبرو ان کے دیوان کو دی ہے +

خوبرویوں کے ہوا حق میں یہ تپ کرنا دوا - — تیرگی جاتی رہی جھڑکے کی اور اچھی صفا

کیا سبب تیرے بدن کے گرم ہونے کا سجن
تو گلے کس کے لگی، لیکن کسی بے رحم نے
آہِ سرد اور چشمِ تر عاشق کی سے وسواس کر
دل مرا تعویذ کر تو لے کے اپنے پاس رکھ
ترش روئی چھوڑ دے اور تلخ گوئی ترک کر

عاشقوں میں کون جلتا تھا گلے کس کے لگا
گرم دیکھا ہوگا تجھ کو بیچ میں آنکھوں کے لا
بد بہت ہے مختلف جس وقت ہو آب و ہوا
تو طفیلِ حضرتِ عاشق تجھے ہووے شفا
اور کھانا جو کہ ہو خوش کا تری[1] سو کر غذا

بوعلی ہے نبض دانی میں بتاں کے آبرو
کیوں نہ ہووے عاشقی میں اس کا نسخہ کیمیا

بوسہ لبوں کا دینے کہا، کہہ کے پھر گیا — ولہ — پیالہ بھرا شراب کا افسوس گر گیا

قول آبرو کا تھا کہ "نہ جاؤں گا اس گلی"
ہو کر کے بے قرار دیکھو[2] آج پھر گیا

وعدے تھے سب خلاف جو اس لب سے ہم ستی — ولہ — کیا لعل قیمتی دیکھو جھوٹا نکل گیا
یہ سبزہ اور ہے آب رواں اور ابر ہے گھرا — ولہ — دوانا نہیں[3] کہ میں گھر میں رہوں گا چھوڑ کر صحرا
چوپڑ[4] کے کھیلنے کا سارا یہ ہے خلاصہ — ولہ — شاید کبھو وہ سر کا بیٹھے ہمارے پاس آ۔
تم اور گلرخوں سے اب آنکھ جو لگا ئے — باداموں کو پیارے پھولوں کے بیچ باسا
پی کر شراب جو تم ہم کو ڈراوتے ہو — کیا شوق کو ہمارے جانا ہے اور کا سا
جب بٹ آیا میں رقیبوں کو گویا مار دیا — ولہ — یار نے اپنے گلے کا مجھے جب ہار دیا
رہنے کوئی[5] اس طرح کے لالچی کو کب تلک بہلا — ولہ — چلی جاتی ہے فرمایش کبھی یہ لا کبھی وہ لا
میرے پیارے سے قاصد اپنے دل کی بات جا کہنا — ولہ — کہ جانے سے تمہارے جان کو مشکل ہے اب رہنا

[1] "خوش کا تری" یعنی "تیری مرضی کا"۔ "خشکہ" کا ایہام بھی مقصود ہے ۱۲ [2] "دیکھو" کو "دِکھو" پڑھنا چاہئے، ورنہ مصرعہ ناموزون ہوگا ۱۲ [3] "نہیں" کو "نہ" کے لہجہ میں پڑھنا چاہیئے ۱۲ [4] یعنی چوپڑ کھیلنے سے سارا مقصد یہ ہے کہ [5] قدما "کوئی" کو "کُئی" کے لہجہ میں ادا کرتے تھے، یہاں بھی اسی طرح پڑھنا چاہئے ورنہ مصرعہ ناموزون ہوگا ۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے	وله	کہ اس کو بد نما لگتا ہے جیسے چاند کو گہنا
سیج اوپر غیر کی رہتا ہے اب لوٹا ہوا	وله	زر کے لالچ اس قدر وہ سیم تن کھوٹا ہوا
جو لونڈا[1] نام سُن امرد پرستی کا چڑھے چو نکے	وله	میں اس کو پیچ دے باتوں میں لگ جاتا ہوں چل لاسا
عاشقوں میں جس کسی کا یار ہو راضی مرا	وله	وہ مراد دشمن ہے لیکن چاہتا ہے جی مرا
جس طرح سے اے نامہ بر آیا ہے چلا جا	وله	جا کر کے یہ کہہ کل نہیں آیا ہے تو آجا
فرہاد کا دل کوہ کو مے کا بھرا پیالا ہوا	وله	مستی سے جس کی شوق کی ہر سنگ متوالا ہوا
کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی	وله	اس دل بے قرار کی صورت
زندگی ہے سراب کی سی طرح	وله	باؤ بندی حباب کی سی طرح
کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو		مجھ سے خانہ خراب کی سی طرح
آبرو کے قتل کو حاضر ہوا کس کر کمر	وله	خون کرنے کو چلا عاشق پہ تہمت باندھ کر
جس وقت زخم تیر الگتا ہے غیر کے تئیں	وله	اُس وقت جان سیتی جاتے ہیں جان مر ہم
دھمکاؤتے ہیں ہم کو کمر باندھ باندھ کر	وله	کھولے ابھی تو جاوے میاں کا نکل بھرم
کن نے آ باغ میں حیران کیا نرگس کو	وله	نہیں معلوم کہ یہ دیکھ رہی ہے کس کو
کہتا ہوں میں پکار، سنو کان دھر سجن	وله	جو اَور سے ملو گے تو دیکھو گے ہم نہیں
ہرگز ترے لبوں کی سرخی کے تئیں نہ پہنچیں	وله	ہر چند سعی کر کر یا قوت و لعل مر جائیں
اک عرض سب سے چھپ کر کرنی ہے ہم کو تم سے		راضی ہو گر کہو تو خلوت میں آ کے کر جائیں
لٹک چلنا سجن کا بھولتا مجھ کو نہیں اب تک	وله	طرح وہ پانوں رکھنے کی مری آنکھوں میں پھرتی ہے
زلف کے عقدے کھلے اب اَور بھی مشکل ہوئی	وله	دل کے اوپر یہ نئے سر سے بلا نازل ہوئی
میاں[2] کے لوگ کہتے ہیں کمر ہے	وله	کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے
دل کب آوارگی کو بھولا ہے		خاک گر ہو گیا بگولا ہے

سلہ اس شعر سے اُس زمانے کی اخلاقی حالت ظاہر ہوتی ہے ۱۲ سلہ یہی شعر بہ ادنیٰ تغیر جرأت کی طرف منسوب ہے ۲،

پھرتے ہی پھرتے دشت دیوانے کدھر گئے		وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے	
مژگاں تو تیز تر ہے و لیکن جگر کہاں		نرگش تو ہیں بھرے یہ نشانے کدھر گئے	
نازک تنی پہ اتنے مغرور ہو رہے ہو	ولہ	موسی کم نہیں تو فرعون کر رکھا ہے	
اٹھ چیت کیوں جنوں ستی خاطر نچنت کی (یعنی ہوشیار ہو)	ولہ	اسے کچھ بہار تجھ کو خبر ہے بسنت کی	

۷-احسن

احسن تخلص، میرزا احسن نام، جوان نیک خصلت ہے۔ ابتدا میں میر رضا سے اتفاق اصلاح کا ان کو ہوا ہے۔ بعد اس کے میرزا محمد رفیع السودا سے مشورِ سخن کا کیا ہے ریختہ ان کا خالی کیفیت سے نہیں ہے، اور بندش شعر کی صاف اور شیریں ہے۔ فی الجملہ غربت بھی رکھتے ہیں، اور نستعلیق وغیرہ اکثر اکثر خطوط بھلے چنگے لکھتے ہیں۔ ابتدا میں وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کی سرکار میں سر رشتہ ملازمت کا رکھتے تھے، بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ایک مدت سے نواب سرفراز الدولہ میرزا احسن رضا خاں بہادر کی رفاقت میں ایام زندگانی کے بسر کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں بود و باش ہے۔ اور یہ ان کا منتخب تلاش ہے +

ہجر میں کیوں کر نہ ہووے آہ و زاری بیشتر	ہے قرار اس دل میں کم اور بیقراری بیشتر
کیوں تفکر دین و دنیا دل ہمارا بھول جائے	یاد رہتی ہے ہمیں پیارے تمہاری بیشتر
بیشتر تھی ہم کو اُس سے دوستی اک طرح کی	اب تو بتلاوے ہے تلوار و کٹاری بیشتر
روز ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روتے ہیں ہم	وصل کی راتیں کٹیں یوں ہی ہماری بیشتر

بن گئے خاک اب اُس کے کوچے سے بھلا کیونکر اٹھو
ہے مزاج اپنے میں احسن خاکساری بیشتر

نہ نالہ ہے دل میں، نہ آہ حزیں ہے	کوئی دم ہے یاں، سو دم واپسیں ہے
گئے دن جو آنکھوں سے بہتے تھے دریا	ادھر دیکھ لو، خشک اب آستیں ہے

گیا دل جو کوچہ میں چین جبیں کے		نہ پھر وہاں سے نکلا عجب سرزمیں ہے
قدم رکھ نہ اپنا مرے دل سے باہر		کہا مان میرا، یہ گھر دل نشیں ہے
نہ کھینچ آسماں پر سر اپنا تو احسن		
سمجھ آخرش سب کا مدفن زمیں ہے		
یار وہ صنم کیوں نہ کرے کام خدا کا	ولہ	رام اُس کا خدا ہے وہ نہیں رام خدا کا
سر اپنے کو جیوں لے گئے ہم اُس کے قدم تک	ولہ	پہنچا دیا ٹھوکریں وہیں ملک عدم تک
سجدہ گہ ہے خاک احسن اب تو سارے خلق کی	ولہ	جان دی تھی اُس نے کس کی حسرتِ پابوس میں
دل ہو ویدا ہے مایوس تو مسرور نہ ہو	ولہ	چشم میں روشنیِ طور سے بھی نور نہ ہو
بزم میں اُس کی جو ہوتی ہے کبھی سرگوشی		دل دھڑکتا ہے کہ میرا کہیں مذکور نہ ہو
ہے مجھ میں رمق، دیدہ تجھے تا نگراں ہے	ولہ	جیوں شمع مرا تار نگہ رشتۂ جاں ہے
محرم ہم ہوں، محرم اسرار ہو کوئی	ولہ	خلوت میں ہو کوئی، پسِ دیوار ہو کوئی
راتوں کو اُس کے کوچہ میں جاتا تو ہوں ولے		دھڑکے ہے دل پڑا کہ نہ بیدار ہو کوئی
پہنچی جس وقت مجھے اس کی خبر آنے کی	ولہ	سدھ رہی مجھ کو نہ اپنے کی نہ بیگانے کی
تم تو دل مانگو ہو، یاں جان تلک حاضر ہے		بات یہ بھی ہے کوئی آپ کے فرمانے کی

۸- الہام

الہام تخلص، شیخ شرف الدین نام، لکھنؤ کے شیخ زادوں میں سے ہیں۔ صغر سن سے دیکھتا ہوں ان کو، اسباب دنیا سے قانع بہ یک چادر ہیں، اور سر و پا برہنہ بیٹھے رہتے خاک پر ہیں۔ زود گوئی کی مشق اس مرد کو حد سے افزود ہے، یہاں تلک کہ ایک مصرع نہیں لکھا جا چکتا کہ دوسرا موجود ہے۔ اسی طرح سو سو بیت تک ایک دریا جوش مارتا چلا جاتا ہے، لیکن اس زود گوئی کے باعث سے اکثر کلام ان کا گفتگو میں بھی آتا ہے۔ دو دیوان فارسی زبان میں

رکھتے ہیں، اور ہندی میں بھی اکثر کچھ کچھ کہتے ہیں۔ آگے ملول تخلص کرتے تھے، اب تخلص الہام ہے۔ بیشتر اہل لکھنؤ کو، شاگردی کے سوائے، ان سے اعتقاد تمام ہے۔ یہ غزل ان کی جو لکھی جاتی ہے، البتہ ایک عالم کو اضطرارِ دل کا دکھاتی ہے +

دیکھا نہ ہو جس نے کبھو سیماب کا عالم		آ دیکھے وہ میرے دلِ بیتاب کا عالم
اے ابر مژہ ناصحوں کی ضد سے تو یکبارگی		سب ارض و سما آوے نظر آب کا عالم
یاقوت کی رنگت پہ کبھی آنکھ نہ جاوے		دکھلاؤں اگر چشم کے خوننابؔ کا عالم
کل پرتوِ حسنِ رخِ دلدار کے آگے		پھیکا نظر آیا ہمیں مہتاب کا عالم
	مانی ترا واللہ ہو بندا ۵؎	
	کھینچے تو اگر دل کے تپ و تابؔ کا عالم	
اری بیکسی تیرے قربان ہوں	ولہ	برُے وقت میں ایک تو رہ گئی

۹-اثر

اثر تخلص، میر محمد نام، شاہ جہان آبادی۔ چھوٹے بھائی تھے خواجہ میر دردؔ مرحوم کے، واقف تھے فن تصوف سے، اور آگاہ تھے علمِ معرفت سے۔ بطور درویشان صاحب معنی کے گوشہ نشینی اختیار کی تھی، اور درد و اثر کے ساتھ نہایت طبیعت ہموار کی تھی۔ بھائی سے اپنے اُنھوں نے کسب کمالوں کا کیا ہے، سچ تو یہ ہے کلام ان کا چاشنی سے درد و اثر کی آشنا ہے۔ ایک مثنوی بہت طولانی بیانِ عشق میں ان کی تصنیف سے ہے، اگرچہ انتخاب اس کا لکھا گیا بہت تخفیف سے ہے +

آہ کے ساتھ جی نکل نہ گیا		آہ اے آہ یہ خلل نہ گیا
میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ	ولہ	پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہو گیا

۵؎ اصل نسخہ میں سادہ جگہ چھوڑی ہے غالباً "یہ الہام" کا لفظ تھا ۱۲

بس ہو یارب یہ امتحان کہیں	ولہ	یا نکل جائے اب یہ جان کہیں
وائے غفلت! کہ ایک ہی دم میں		میں کہیں، اور کاروان کہیں
بے وفا تجھ سے اب گلا ہی نہیں	ولہ	تو تو گویا کہ آشنا ہی نہیں
یا خدا پاس، یا بتاں کے پاس		دل کبھی اپنا یاں رہا ہی نہیں
دل سے جو چاہیئے سو باندھئے بات		میں نے واللہ کچھ کہا ہی نہیں
تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں	ولہ	پر ہمیں آہ کچھ خبر ہی نہیں
دردِ دل چھوڑ جائیے، سو کہاں؟		اپنے باہر تو یہاں گذر ہی نہیں
حال میرا نہ پوچھئے مجھ سے		بات میری تو معتبر ہی نہیں

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے
اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

کیا کیجے اختیار نہیں دل کی چاہ میں	ولہ	ہیں سب وگرنہ یہ تری باتیں نگاہ میں
ہم ہیں بیدل، دل اپنے پاس نہیں	ولہ	آہ اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں
پوچھ مت حالِ دل مرا مجھ سے		مضطرب ہوں مجھے حواس نہیں
بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر		مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی تو ہم کو آس نہیں

میں کہاں تو کہاں، یہ کہتے ہیں	ولہ	کہ یہ آپس میں دونوں رہتے ہیں
جو سزا دیجے، ہے بجا، مجھ کو	ولہ	تم سے کرنی نہ تھی وفا مجھ کو

وہی میں ہوں اثر وہی دل ہے
اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

ایک تنہا خاطر محزوں، جسے آزار سو	ولہ	ایک مجھ بیمار سے وابستہ ہیں آزار سو

کچھ ان روزوں دل اپنا سخت بے آرام رہتا ہے
اسی حالت میں لیکر صبح سے تا شام رہتا ہے

بیاں میں کیا کروں اب اس سے آگے اپنی ناکامی
ترے یہ طور، اور مجھ کو تجھی سے کام رہتا ہے

ولہ

اثر کیجئے کیا، کدھر جائیے
مگر آپ ہی سے گذر جائیے

کبھو دوستی اور کبھو دشمنی
تری کون سی بات پر جائیے

ولہ

صرفِ غم ہم نے زندگانی کی
واہ کیا خوب زندگانی کی!

ولہ

ناک تیری عجب سجیلی ہے
پتلی اور اونچی اور نکیلی ہے

ولہ

ناک[۱] ہے، یا کہ ایک توتا ہے
چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے

نتھنے ایسے ترے پھڑکتے ہیں
جانور وحشی جیوں پھڑکتے ہیں

ذائقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں
شہد و شربت جو کچھ کہو سب ہیں

دانت جب مجھکو یاد آتے ہیں
دل کلیجا سبھی چباتے ہیں

دیکھ کر آنکھیں آبدار کو یہاں
لوٹ جاتا ہے گوہرِ غلطاں

گر کبھو اس کے جی میں آوے ہے
مسی دو انگلیاں لگاوے ہے

دانت پھر یوں چمکتے ہیں سارے
رات اندھیری میں جیسے ہوں تارے

جب خیال آبندھے ہے گردن کا
یہاں ڈھلک جائے ہے مرا منکا

گو کہ شفاف ہے تنِ مینا
یہاں تو جھکتی ہے گردنِ مینا

کیوں نہ کھینچے وہ سب سے آپ کو دور
جس میں ایسا بھرا ہوا ہو غرور

دھیان میں جب وہ بازو آتے ہیں
ہاتھ پاؤں اپنے پھول جاتے ہیں

کیا خوش آیند یہ کلائی ہے
اس کو دل لینے کی کل آئی ہے

---

[۱] مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنو کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنو سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کی وجہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی، اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے ۱۲

۱۰-الم

الم تخلص، صاحب میر نام، شاہ جہان آبادی۔ خلف الصدق خواجہ میر درد مرحوم کے۔ درویش صاحبِ حقیقت اور پہچاننے والے رموز معرفت کے ہیں۔ سنہ ۱۱۹۴ گیارہ سو چورانوے ہجری میں رونق بخش بلدۂ مرشد آباد کے ہوئے تھے، اور دوستی سے راجہ دولہ رام کی چند مدت اس شہر میں رہے تھے۔ بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ ہجری ہیں، شاہ جہان آباد میں توکل اور قناعت کے ساتھ اوقات شریف کو بسر کرتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں:

دھمکاتے ہیں بس مجھ کو فقط آپ اکڑ کر	بانکے ہو تو مونڈھا چلو مونڈھے سے رگڑ کر
ہنگامِ فغاں تھا خس وپنبہ قفس و دام	تارِ رگِ گل نے ہے رکھا ہم کو جکڑ کر
جب نامِ خدا دور سے وہ جلوہ نما ہو	مر جائیں صفوں کی صفیں حیرت سے بچھڑ کر
مندیل کا تو پیچ اُٹھا بیٹھے گا اے شیخ	چھٹ اس کے نہ کچھ یاد ہے گا رندوں سے جھگڑ کر

آجاتا ہے دُکھ درد بھلانے کو الم یہاں
کیا اس سے مزاحم ہو اُٹھاتے بھلا اڑ کر

نہ دل کو قرار بے قراری کے سبب	رباعی	نہ چشم کو خواب اشک باری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھو		جو کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

۱۱-اشتیاق

اشتیاق تخلص، شاہ ولی اللہ نام، متوطن سرہند کے۔ اس رونق بخشِ دینِ احمدی کا سلسلۂ ارادت شیخ احمد کو، کہ مجدد الف ثانی جن کا لقب تھا، پہنچتا ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاہ محمد گل کو جد ان کا لکھا ہے، لیکن راقم حقیر کے گوش زد یہ مضمون نہیں ہوا ہے۔ فی الحقیقت مرتبہ علم کا اس عالی جناب کے نہایت بلند تھا خصوص علم حدیث اور تفسیر میں بہت

بڑی دستگاہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ اسم گرامی اس برگزیدۂ روزگار کا زبانِ خلائق پر آج کے دن تک شاہ ولی اللہ محدث کر کے جاری ہے۔ اکثر کتابیں تصنیف اس بحرِ علم کی مشہور ہیں۔ چنانچہ دو نسخے کہ ایک کا نام "قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسنین" ہے، اور دوسرے کا نام "جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ"[1] کہتے ہیں تصنیفات سے اس محی الدین کی یادگار صفحہ روزگار پر ہیں۔ والد ماجد ہیں یہ اُس رونق بخش کشورِ قناعت کے، کہ جس کا نام نامی مولوی عبدالعزیز ہے۔ آج کے دن تک قدمِ توکل گاڑے ہوئے شاہ جہان آباد میں بیٹھے ہیں، باوصفیکہ تفضل حسین خاں مرحوم نے موجب ایما صاحبانِ عالی شان کے مدرسہ قدیم کی مدرسی کے واسطے تحریک اس مرکزِ دائرۂ قناعت کی چاہی، لیکن اس قطبِ آسمانِ ملت و دین نے مطلقاً حرکت جگہ سے نہ فرمائی۔ اس فاروق زماں کی بھی تالیف سے ایک کتاب ہے، کہ نام اس کا "تحفۂ اثنیٰ عشریہ" ہے، اور دوسرا نام "رد روافض" شاید کہتے ہیں سچ تو یہ ہے دیکھنے سے اس کتاب کے استعداد اس بزرگ زادے کی معلوم ہوتی ہے، کہ گیا دریا فصاحت کا بہایا ہے۔ کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے۔ فی الواقعہ کہ عالی مقداروں کے عالی مقدار ہی ہوتے ہیں، اور نابکاروں کے نابکار، بقول ایک شاعر کے ◆

شیر کے بچے میں عرشِ شیر سے افزود ہے	بھونکیں کتے کی بلی کی سگی موجود ہے[2]

الغرض وہ جامع جمیع علوم یعنی شاہ ولی اللہ مرحوم حین حیات میں اپنی کوٹلہ میں فیروز شاہ کے تشریف رکھتے تھے۔ اوقات شریف کو بطور درویشان اہل معنی کے بسر کرتے تھے۔ اشعار فارسی کے فرمانے کا اتفاق کمتر ہوتا تھا، اور زبان ریختہ کا مشغلہ اکثر۔ یہ اشعار خلاصۂ افکار اُس حقیقت آگاہ کے ہیں ◆

[1] دونوں نام غلط ہیں۔ پہلی کتاب تفضیل شیخین میں ہے۔ شہادت امام حسین علیہ السلام کی ابطال سے خدانخواستہ اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اور دوسری کتاب تو بالکل فرضی ہے۔ معاویہ کے مناقب میں ان کی کوئی کتاب نہیں ۱۲

[2] شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب، دونوں کی مصنف نے ہجو ملیح کی ہے، اور اس شعر نے تو صاف پردہ اٹھا دیا ہے ۱۲

خیال دل کو ہے اُس گل سے آشنائی کا	نہیں صبا کو ہے دعویٰ جہاں رسائی کا
کہیں وہ کثرتِ عشاق سے گھمنڈ میں آ	ڈروں ہوں میں کہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا
مجھے تو ڈھوکے[له] تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج	غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا
جہاں میں دل نہ لگانے کا لیوے پھر کوئی نام	بیان کروں میں اگر تیری بے وفائی کا
نہ چھوڑا مار بھی کھا کر گذر گلی کا تری -	رقیب کو مرے دعویٰ ہے بے حیائی کا
نہیں خیال میں لاتے وہ سلطنت جم کی	غرور ہے جنہیں در کی تری گدائی کا

جفائے یار سے مت اشتیاق پھیر کے مُنہ
خیال کیجو کہیں اور جبہہ سائی کا

لڑکوں کے پتھروں سے لگے کیونکہ اسکو چوٹ	ولہ	پر ایک کر دیا ہے یہ مجنون کو دھول کوٹ
چھوڑ کر تجھ کو ہمیں غیر سے جو لاگ لگی	ولہ	نہیں مہندی یہ ترے تلوؤں سے ہے آگ لگی
دو بالا ہو کے مخموری عبث آنکھوں کو ملتا ہے	ولہ	پیالہ اور بھی پی پی سجن یہ دور چلتا ہے

۱۲- انشا

انشا تخلص، میر انشاء اللہ خاں نام، بیٹے ہیں حکیم میر ماشاء اللہ خاں کے، مصدر جن کا تخلص تھا عجب شخص خوش اختلاط اور صاحب استعداد ہے۔ سوائے قصیدوں کے مثنویاں زبان عربی میں اُنہوں نے نظم کی ہیں، اور ترکی کی غزلیں بھی ان کی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ زبان فارسی میں صاحب دیوان ہیں۔ کشمیری اور مارواڑی کے سوائے اور بھی بہت سی بولیوں کے زبان دان ہیں۔ سال گذشتہ اُنہوں نے ایک قصیدہ زبان ریختہ میں غیر منقوط، یعنی جن کے اشعار میں کوئی حرف صاحب نقطہ نہیں ہے، نواب عماد الملک کی مدح میں لکھ کر کاپی بھجوایا، اور صلے میں اس کے انعام تحسین اور آفرین کا بہت

له یعنی طعنہ دیتا تھا ۱۲

سا پایا۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ ہجری ہیں، مرشد زادۂ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کے سایۂ عاطفت میں لکھنؤ کے اندر اوقات ساتھ قناعت اور شکستہ پائی کے بسر کرتے ہیں۔ دیوان انکا زبان ریختہ میں مشہور ہے، اور کلام ان کا ظرافت اور خوش اختلاطی سے معمور۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں +

تم جو کہتے ہو، "مجھے تو نے بہت رسوا کیا" — کیا گنہ، کیا جرم، کیا تقصیر، میں نے کیا کیا
واسطہ، باعث، سبب، موجب، جہت، کچھ بات بھی — راز وہ کم بخت کیا تھا، میں نے جو افشا کیا
کیا کہا؟ کن نے کہا؟ کس سے کہا؟ کب؟ کس گھڑی؟ — کس جگہ؟ کس وقت؟ کس دم؟ آپ کا چرچا کیا
کچھ پتا بھی؟ نام اُس کا؟ شکل کیسی؟ وضع کیا؟ — جس کسی نے آن کر مذکور اس ڈھب کا کیا
گبر ہے وہ؟ یا مسلمان؟ یا نصارا؟ یا جہود؟ — اس طرح کا تذکرہ جس شخص نے میرا کیا
شیخ ہے وہ؟ یا مغل ہے؟ یا کہ سید؟ یا پٹھان؟ — موچھ ڈاڑھی ہے؟ کہ مولا نے اُسے کھوسا کیا؟
ہے جواں سا؟ یا وہ امرد؟ یا کہ بوڑھا؟ یا ادھیڑ؟ — مرد ہے؟ یا حق تعالےٰ نے اُسے خنثا کیا؟
نوکری پیشوں میں ہے؟ یا اہل حرفہ وہ عزیز؟ — کون ہے جس نے اجی جا سے تمہیں بیجا کیا؟
کس محلہ میں رہے ہے؟ ہے کہاں کا وہ خبیث؟ — کوئی شیطاں ہوئے گا جس نے کہ ذکر ایسا کیا
کذب، بہتان، افترا، طوفان، غلط، بالکل دروغ — میں تمہارا نام لے لے کب بھلا رویا کیا
مرحبا، شاباش، اے رحمت خدائی، آفریں — میرے حق میں تم نے باور اور کا کہنا کیا
چودھویں تاریخ اک ابرِ تُنک سا تھا جو رات — صحنِ گلشن میں عجائب سیر میں دیکھا کیا
جھلملی سی چادرِ مہتاب اور پر برق کا — وہ دوپٹا بادلے کا سا جو لہرایا کیا
یوں لگا معلوم ہونے ہیں یہ دو پریاں بہم — ایک نے گویا کہ سایا دوسری پر آ کیا
بوئے گل بولی کہ "آج آپس میں بدلی اوڑھنی — چاندنی بائی نے بی خیلا سے بہنا پا کیا"

خود بدولت تو نہ آئے، اور انشا رات بھر
آپ بن رویا کیا، لوٹا کیا، تڑپا کیا

گالی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی
گر نازنیں کے کہنے سے مانا ہو کچھ بُرا
آگے بڑھے جو جاتے ہو کیوں کون ہے یہاں

وله

یہ سب سہی، پر ایک نہیں کی نہیں سہی
میری طرف کو دیکھئے! میں نازنیں سہی
جو بات تجھ کو کہنی ہے مجھ سے یہیں سہی

منظور دوستی جو تمہیں ہے ہر ایک سے
اچھا تو کیا مضائقہ! انشاؔ سے کیں سہی

بندہ اُسے جب نظر پڑا ہے
وله
بولا ہے "چل اُٹھ ناگدھر پڑا ہے"

ہوئے ہیں خاک سرِ راہ اُس کے ہم انشاؔ
بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

۱۳- امانیؔ

امانیؔ تخلص، میر امانی نام، خلف ہیں یہ خواجہ آثمیؔ کے، جن کا مذکور اوپر ہوا ہے۔ ۱۱۸۱ھ گیارہ سو اکاسی ہجری میں وارد مرشد آباد کے ہوئے تھے، اور جناب سید الشہدا کی تعزیہ داری کا شغل ہمیشہ رکھتے تھے۔ مرثیۂ ہندی اپنے کہے ہوئے اکثر ممبر پر کھڑے ہو کر پڑھتے، اور مؤمنین کے تئیں سعادتِ گریہ کی دولت سے داخلِ ثواب کرتے۔ ایک شب جناب سید الشہدا علیہ السلام کی عین تعزیہ داری میں، کہ ۱۱۸۷ھ گیارہ سو ستاسی ہجری تھے، بیہوش ہو کر سیر کرنے والے روضۂ رضوان کے ہوئے۔ حق سبحانہ تعالیٰ مغفرت کرے عجب مرد خوش اعتقاد اور دیندار تھا۔ نشۂ محبت میں اہل بیت نبوی کے سرشار تھا۔ یہ اشعار یادگار اُس نکوکردار کے ہیں:

اُس کے کوچہ سے جو غبار اُٹھا
کون ساواں سے خاکسار اُٹھا

عندلیبو بساؤ اب صحرا
باغ سے موسمِ بہار اُٹھا

ہچکیاں لے گلابیاں روئیں
بزم سے جب وہ مے گسار اُٹھا

عزمِ رخصت ہوا جب ہی اُس کا		میرے دل سے وہیں قرار اُٹھا
نہیں جو قدرِ اشک، عالم سے		موتیوں کا مگر وقار اُٹھا
شمع سے سوز امانیؔ پوچھا تیرا		اک دھواں اسکے دل سے یار اُٹھا
راہ تکتے تکتے آخر جیسے آیا تنگ دل	ولہ	آنکھیں تو پتھرا گئیں، پر وہ نہ آیا سنگدل
ہو چکا ہے غم سے خوں، اب جلد یہ جائے کہیں		خوف ہے یارب! نہ بدلے اور بھی کچھ رنگ دل
قدر جان اس کی کہ اک عالم سے یہ بیگانہ ہو		گر رہا ہے تیرے در پر کھو کے نام و ننگ دل
فندقِ پا کس کی دیکھی آہ! جسکے غم سے آج		قطرۂ خوں ہو بنا رشکِ گلِ اورنگ دل
اپنی آنکھوں آگے کو اس کی گلی میں ہے پڑا		پر امانیؔ آپ سے ہے سیکڑوں فرسنگ دل
گھیرا ہے مجھے غم نے عجب حال ہے جی کا	ولہ	اے نالۂ دل! وقت ہے فریادرسی کا
سینہ میں جدھر رو ہو ترا پھونک دے اے آہ		ٹک دل سے خبردار! کہ یہ گھر ہے کسی کا
اُس کے کوچہ سے صبا آج اس طرف آئی نہیں	ولہ	دیر ہوئی وہاں مقیموں کی خبر پائی نہیں
وائے اپنی اس بصارت پر، کہ ہر ذرہ میں آہ!		جلوہ گر ہے آفتاب، اور تاب بینائی نہیں
کونسا دن ہے کہ مجھ کو یاد تو آتا نہیں	ولہ	کونسا دم ہے، کہ آنکھوں بیچ پھر جاتا نہیں
عشق میں کس کے امانیؔ مبتلا ہے، جس بغیر		تجھ کو نظارہ گلوں کا ان دنوں بھاتا نہیں
چمن سب لہلہاتے ہیں پڑے، بادل برستے ہیں	ولہ	شتاب آ ساقیا! ہم بادہ نوشی کو ترستے ہیں
زمانہ جائے عبرت ہے، چمن کا حال چل دیکھو		تجمل جن گلوں کا کل تھا سو وے آج جھڑتے ہیں
مساوی جانیو خوش طالعی و کو نصیبی کو		امانیؔ! منعم و مفلوک سب کے دن گذرتے ہیں
امانیؔ تو ہوا تیغ تغافل ہی ستی بسمل	ولہ	بھلا بتلائے کس پر کمر اب آپ کستے ہیں
ہم ترا نزع تلک جور سہے جاتے ہیں	ولہ	یاد آویں گے بہت اتنا کہے جاتے ہیں
لے گیا کون مری تاب و تواں کو یک لخت		کہ سب ہی عضو میرے آج ڈھے جاتے ہیں
وائے واماندگی اپنی کہ یہ آنکھوں آگے		کارواں رو میں ہے، ہم پیچھے رہے جاتے ہیں

اثر ہو سنگ میں کیا، کیوں کہ ان کو رام کریں
وہ ایک بار بھی تیری نظر پڑے زاہد
کس کے یہ خار مژگاں دل میں کھٹک رہے ہیں
دیکھ تو کیا ہی وہ بت سنگ دلی پر نازاں
یارو گر دار پہ منصور نہیں دیکھا ہے۔
صفِ مژگانِ آہو چشم کا ہوں کشتہ، اے یاراں
زباں پر راز عاشق کا نہ لانا سر کٹا دینا
میں نے پہلو سے گم کیا تجھ کو
اشک، آوارگی سے تو نہ تھما
پنکھوں سے دل پھپھولو کیا سوختہ کر رہے ہو
اور میانِ خالِ شکر لب پہ تمہارے
اللہ رے صنم! یہ تری خود نمائیاں
دم بدم اس کی خلش سے اب مجھے آزار ہے

وله بتوں کے دل ہو، تو یارب یہ آہیں کام کریں
صلاح و زہد رہے یہ، تو ہم سلام کریں
وله جو چشم سے لہو کے قطرے ٹپک رہے ہیں
وله تجھ میں اے نالۂ جانکاہ! اثر ہے کہ نہیں
وله نوکِ مژگاں یہ مرے لختِ جگر کو دیکھو
وله سرِ تربت یہ چُن دیجو مرے خارِ بیاباں کو
سرِ رشتہ کس سے ہاتھ آیا ہے یہ شمعِ شبستاں کو
وله آہ دل! کن نے لے لیا تجھ کو
میں نے آنکھوں میں گھر دیا تجھ کو
وله پھوٹو کہیں، کہاں کی آتش میں بھر رہے ہو
وله بوسہ میں بھی شاید مزۂ تل شکری ہو
وله اس حسن چند روزہ پہ اتنا غرور ہے۔
وله دوستاں یہ دل نہیں، پہلو میں میرے خار ہے

چاہ میں کس کی دل ڈبو بیٹھے
کیوں امانی گیا نہ آخر دل
آہ اب میرے دم کے ساتھ ہوئی
ہم سا جو ناتواں عقب کارواں رہے
صدمے جو پڑے ہیں دل پہ غم کے
خوش خواب میں ہیں، مگر جواب تک
ہے صبح کو عزمِ رفتنِ یار

وله آہ! ہم کیسے دل کو رو بیٹھے
کفِ افسوس اب ملو بیٹھے
وله پاؤ پر عمر کے برات ہوئی
وله جوں نقشِ پا وہیں ہوئے پھر جہاں رہے
وله آنسو نہیں تھمتے چشمِ نم کے
جاگے نہیں خفتگاں عدم کے
ٹک نکلیو آفتاب تھم کے

آنکھیں نہیں مندتی ہیں عجب جی پہ تعب ہے
وله یارب دل حیراں کو مرے کس کی طلب ہے

دم لینے نہیں دیتے ہیں ہم کے یہ نالے	ولہ	کیا جانئے کیا دل کو مرے مطلب ہے
ہجراں کے شب و روز کا مت پوچھو گذرنا		دن کٹ گیا جوں توں کے، تو پھر رات غضب ہے
مدت سے سروکار غم ہجر ستی ہے		کچھ عیش سے تو کام نہ آگے تھا نہ اب ہے
نامہ برکھیو زمانے کی تڑپ تھی تجھ بن	ولہ	شمع شب دیکھ مجھے صبح تلک روئی ہے
بارہا منع کیا چھوڑ دے بے رحم کی چاہ	ولہ	باز نہیں آتا، امانی بھی عجب کوئی ہے
سیر گلشن کو میں جاتا تھا جو صیاد مجھے	ولہ	دیکھ کر دور سے بولا کہ "شکار آتا ہے"

۱۴- امین

امین تخلص، خواجہ امین الدین نام، عظیم آبادی۔ عالم دوستی اور اتحاد میں باقرینہ ہیں۔ علی ابراہیم خاں مرحوم کے یار دیرینہ ہیں۔ شعر فہمی اور سخن رسی میں زمانے کے یادگار ہیں۔ مضمون تراشی اور ادا بندی میں نادرِ روزگار ہیں۔ ذہن کو ان کے بندش کی صفائی میں نہایت ارجمندی ہے۔ اور طبیعت کو ان کی تلاش معانی میں اپنے ہمعصروں سے بلندی ہے۔ چند مدت نواب میر محمد رضا خاں مظفر جنگ بہادر کی رفاقت میں اوقات اُنہوں نے بہ کیفیت کاٹی ہے۔ بعد اس روزگار کے قناعت اور جواں مردی کے ساتھ خانہ نشینی میں زندگی بسر کی ہے۔ ایک دیوان چھوٹا سا زبان ریختہ میں ان کی تصنیف سے ہے منتخب اس کا یہاں لکھا گیا بہت تخفیف سے ہے +

دنیا میں جو آکر نہ کرے عشق بتاں کا		نزدیک ہمارے ہے یہاں کا نہ وہاں کا
مانند نگیں آپ سے کاوش میں پڑا ہے		مشتاق جو کوئی ہے یہاں نام و نشاں کا
کرتا ہوں امیں میں تو ثنا اُس کی و لیکن		مُنہ لال ہوا جاتا ہے خجلت سے زباں کا
پردے سے جو وہ شہرۂ آفاق نکلتا	ولہ	تب دیکھتے خورشید کا یہ نام نکلتا
تھا کچھ بھی مناسب کہ نکلوا دیا تو نے		گر صبح نہ نکلا تھا امیں شام نکلتا

گھر مرے آنا اگر منظور تھا　وله　آئے ہوتے لطف سے کیا دور تھا
گالیاں جو دیں سو دیں، بس کیجئے　سُن چکے ہم جب تلک مقدور تھا
یہ دل خالی نہیں کوئی دم رہے گا　وله　تو جاوے گا تری　غم رہے گا
جس کا دل آپ نے لیا ہو گا　وله　خاک میں سے ملا دیا　ہو گا
ہم کو کیا، گر بہار آتی ہے　دل وہ غنچہ نہیں کہ وا ہو گا
گالیاں غیر سے سُناتے ہو　ہاں میاں! تم سے اور کیا ہو گا
مل گیا ہو گا خاک میں جوں اشک　تیری آنکھوں سے جو گرا ہو گا

بتاں کے واسطے گھر بار کو اپنے بہا نکلا　وله　یہ طفلِ اشک میرا عاشقی میں بے بہا نکلا
وہی مقصودِ دل ہے، اور وہی منظور آنکھوں کا　وله　سرورِ سینہ میں اس کو کہوں، یا نورِ آنکھوں کا
کیا ایک مجھ کو بھاتی ہے برسات کی ہوا　وله　کس کو نہیں خوش آتی ہے برسات کی ہوا
جب آہ سرد بھرتا ہوں کانپے ہے تن امیں　جوں شاخ کو ہلاتی ہے برسات کی ہوا
خورشید ترا دیکھ کے منہ کانپ کے نکلا　وله　مہ چادر مہتاب میں مُنہ ڈھانپ کے نکلا
شور ہے عالم میں تیرے حُسنِ عالم گیر کا　وله　تو ہی ہو گا گر کوئی ہو گا تری تصویر کا۔
عشق کی دولت سراپا میں طلا کے رنگ ہوں　اے ہوس دیکھ لے نسخہ ہے یہ اکسیر کا
چوستا ہے جوں سرِ پستاں کو طفلِ شیر خوار　چاہتا رہتا ہے دل پیکان اُس کے تیر کا

گر ارادہ نہیں ہے آنے کا　وله　فائدہ اس قدر بہانے کا؟
خط نے مارا ہے حسن پر شب خوں　کیا ہی جھگڑا ہے　سوا ٹیکا
سخت کاوش میں ہوں بہ رنگ نگیں　وله　ایسی نام آوری کا مُنہ کالا

دل ہرا سینہ سے یوں لیتی ہے وہ زلفِ دوتا　وله　اپنے دیوانوں سے کیا رکھتی ہیں یہ زنجیر کھینچ
بکھتی ہے جب مری صورت کو بل کھاتی ہے زلف　جس طرح مجمر سے لے اخگر کو آتش گیر کھینچ
جس طرح شاخ کو ہوتا ہے ثمر سے پیوند　وله　کاش نالے کو مرے ہوئے اثر سے پیوند

یاالٰہی کسی ظالم کے پڑے پنجہ میں		بے طرح پشکہ کو ہے اُس کی کمر سے پیوند
دیکھ بھال اس دل صد چاک کو لیتے ہیں بتاں		میں نے یہ شیشہ کیا کیا ہی ہنر سے پیوند
مرتے ہیں ہم تو اُس کے لبِ آبدار پر	وله	گر آبِ[1] زندگی ہو تو مارے ہیں دھار پر
بوسہ دیا تھا، جی میں جو آوے تو پھیر لو		اتنا خفا ہو کس لئے اس خاکسار پر
اس شمع رو کے سامنے آتا ہے تو پتنگ		بھاری ہوئے ہیں، کیا تجھے اپنے دو چار پر
دب نکلتا ہے اگرچہ سب سے ہے بالا پہاڑ	وله	دیکھتا ہے جب ہماری آہ کا کالا پہاڑ
کھودیا کوہ کن نے جان شیریں کے لئے		اس کی فرمایش کا اپنے سر سے تو ٹالا پہاڑ
آ دیکھے تری زلفِ گرہ گیر ہوا پر	وله	جن نے نہ کبھی دیکھی ہو زنجیر ہوا پر
ڈر سے ترے نالہ بھی نکلتا نہیں لب سے		ظالم ہے ترے ظلم کی تاثیر ہوا پر
اُڑتا ہے ہو کے مضطرب اس کے بام و در پر	وله	نامہ مرا کہاں ہے ہے کاغذی کبوتر
ہے نہیں جوہر نمایاں تیغ تیز یار پر	وله	لکھ رہا ہے نام مقتولوں کا اس تروار پر
یار کے مژگاں سے لڑ جاتی ہے یوں تیر نگاہ		جس طرح تروار کوئی آ لگے تروار پر
دل خیال زلف میں بے خواب و بے آرام ہے		رات ہوتی ہے ایں بھاری ہر اک بیمار پر
آئی بہار ہو گئے ہر خارِ راہ سبز	وله	لیکن ہوئے نہ آہ یہ بختِ سیاہ سبز
شاداب ہے خط اس کے لب آبدار پر		رہتا ہے گرد جادہ کے اکثر گیاہ سبز
دل میں ترے خیال ہے کس نونہال کا		لب سے آہیں نکلتی ہے ہر ایک آہ سبز
یار آیا ہے اب نہ یہ اے چشم	وله	دیکھنے دے ذرا تو رہ اے چشم
کیا کہوں یار سے اپنی سی کئے جاتا ہوں	وله	گالیاں کھاتا ہوں غصہ کو پئے جاتا ہوں
جی نکلتا ہے، یہ لب یاد میں ہلتے ہیں تری		مرتے مرتے بھی ترا نام لئے جاتا ہوں
چاک سینہ کا مرے لوگ عبث سیتے ہیں	وله	ہم تو زخمی ہیں نگاہوں کے، کوئی جیتے ہیں

[1] "آب زندگی" سے "آب حیات" مراد ہے جس پر خضرؑ کا قبضہ کہا جاتا ہے ۱۲

سیل آتی ہے تو آنے دو مرا کیا لے گی
گھر میں ایک میں ہوں پڑا، اور کئی بہتے ہیں
فائدہ کیا ہے بھلا ہم جو کریں فکر معاش
غم کو کھاتے ہیں ابیں خون جگر پیتے ہیں

ولہ

سر پہ خوباں جو بال رکھتے ہیں
مو بمو جی کا کال رکھتے ہیں
سرو پر اتنا بھول مت قمری
ہم بھی اک نونہال رکھتے ہیں
دل تو کیا ہے، ابیں جو آوے یار
جان آگے نکال رکھتے ہیں

ولہ

بتاں مجھ سے کہتے تھے کیا کچھ نہیں
ولیکن جو دیکھا، تو تھا کچھ نہیں
میں بوسہ جو مانگا، جو جھنجلا کے وہ
لگا کہنے کیا ہے، کہا کچھ نہیں

ولہ

مجھے بے چین رکھتا ہے دل افگار پہلو میں
وہ سوئے کس طرح جس کے رہے بیمار پہلو میں
گرفتاروں کو تیری زلف کے کس طرح خواب آوے
بساں شانہ رہتا ہے انہوں کے خار پہلو میں

ولہ

مجھے تو کبھی عمر بھر غم نہ ہو
ملاقات تیری اگر کم نہ ہو
میں درگذرا صاحب سلامت سے بھی
خدا کے لئے اتنا برہم نہ ہو
ہم آنے کو مانع نہیں غیر کو
پر اتنا بھی خلوت میں ہر دم نہ ہو
ابیں کی غذا آ رہی ہے یہی
الٰہی یہ خونِ جگر کم نہ ہو

ولہ

ہوئی ہے آشنائی جب سے اس مے نوش سے مجھ کو
جو صاحب عقل ہیں کہتے ہیں اہل ہوش سے مجھکو
بھلا تو ہی کہہ اے دل کسی کو یہ توقع تھی
نکالے گا وہ صبح عیدیوں آغوش سے مجھ کو
جدائی سے سراپا رنگ میرا زعفرانی ہے
کوئی لے کر ملا دے اس بسنتی پوش سے مجھ کو
بھڑکتا ہے جگر میرا دل پر داغ کے دولت
ابیں جلنا پڑا اس آتشِ خاموش سے مجھ کو

ولہ

کیا کہیں دودِ آہ کی تاثیر
گھر کا گھر ہے سیاہ، مت پوچھو
مفت مارا گیا ہزار افسوس
تھا ابیں بے گناہ مت پوچھو

ولہ

جب دکھاتا ہے وہ شرابی آنکھ
وہ نہیں جاتی ہے گلابی آنکھ
لختِ دل گتھ رہیں ہیں مژگاں سے
ہے مگر خانۂ کبابی آنکھ

روشن ہیں شب ہجر میں یہ دیدۂ بیدار
دھڑکے سے ہے مرا دل کہ کہیں کچھ نہ لگا دیں

ولہ

جوں زلفیں چمکنے میں ترے کان کے موتی
لگتے ہیں ترے کان سے جب آن کے موتی

دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی
صبح گر صبح قیامت نہو، تو کچھ پروا نہیں

ولہ

عمر کٹنے کو کٹی، پر کیا ہی خواری میں کٹی
ہجر کی جب رات ایسی بے قراری میں کٹی

تیری آنکھوں کی پرستاری میں دل گھبرا گیا
اس زمانہ میں امیںؔ مت کر کسی سے دوستی

ہائے اس بیمار کی بیمار داری میں کٹی
شمع کی گردن، نہ دیکھی دوست داری میں کٹی

دل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھئے
دھڑکے سے ہے دل کمر کو جو کستے ہوا ہے میاں

ولہ

بلبل کو باندھئے تو رگ گل سے باندھئے
باریک بال سے ہے، تاٗمل سے باندھئے

جلوہ ترے حُسن کا کہاں ہے

ولہ

یوں کہنے کو آفتاب ہاں ہے

ہم رہیں دیکھتے اور تیری یہ اوقات کٹے
ایک دم ہوگئی گر اُس سے ملاقات تو کیا

ولہ

اور تو کیا کہوں اے شانہ ترا ہاتھ کٹے
زندگی کا ہے مزا یہ کہ مساوات کٹے

رنگ چہرے کا زعفرانی ہے
کس سے تشبیہ دیں بھلا تجھ کو
شمع رویاں سے اتنا گرم نہ مِل
رات دن بھیکتے ہی جاتا ہے

ولہ

عاشقی کی یہی نشانی ہے
دیکھا یوسف تو تیرا ثانی ہے
ان کی جو بات ہے زبانی ہے
کیا امیںؔ ایسی زندگانی ہے

خضر نے ایک دم پیا تھا لے کے آب زندگی
کیا بھلا اس میکدے میں جی کسی کا شاد ہو
معنئ آرام کیا ہے، تو نہ کچھ سمجھا امیںؔ

ولہ

مانگتے ہیں اب تلک اُس سے حساب زندگی
مر گیا آخر کو پی جن نے شراب زندگی
ہم تو مدت سے اُلٹتے ہیں کتاب زندگی

غیر سے کیوں کہ وہ چھوڑے ملنا

ولہ

چھوڑتا ہے کوئی اپنے بانے

ہم کھڑے تھے سامنے، اور اغیاروں میں تھے
جتنے تھے محفل میں، تھا سب سے تپاک اور اختلاط

ولہ

ٹک تو منصف ہو جئے، ہم کبھی یاروں میں تھے
ایک ہم کم بخت گویا واں گنہگاروں میں تھے

ہاتھ اُٹھانا جان سے پیارے نپٹ دشوار ہے		کیوں نہ دیکھا کل سبھی تو ناز برداروں میں تھے
بھر عمر گدائی میں بھی کرتے رہے شاہی	ولہ	دنیا میں جو ٹھانے تھے میاں، ہم نے نباہی
خط کو جو تراشے ہے بھلا فائدہ کیا ہے		اب چڑھ چکی اے یار سپیدی پہ سیاہی
کیا دین سے غافل ہیں ایس مردم دنیا		سکّہ کو سمجھتے ہیں سدا اپنا الٰہی
تمہاری آنکھیں جو دیکھتے ہیں، نپٹ ہی لگتی ہیں پیاری پیاری	ولہ	پر اس قدر ہیں جو خوں کی پیاسی، یہ کافر آنکھیں ہیں یا کٹاری
تری نگہ کے جو ہوں گے مارے، نہ مانگا ہوگا انھوں نے پانی		نہ ایسی دیکھی ہے تیغ ہم نے، نہ ایسی دیکھی ہے آبداری
اظہار نہیں اگرچہ سر کا	رباعی	پر بوجھ اُتاروں ہوں میں اپنے سر کا
سائل کو جواب ترش ہرگز مت دے		بھوکا ہے، کیا کرے گا لے کر سر کا
یہ جور و جفا یہ بے وفائی کب تک	رباعی	بس کیجئے، پاس آشنائی کب تک
کرتا ہے کوئی حسن پر اتنا بھی غرور		دیکھیں تو رہے ہے یہ خدائی کب تک
کیا شہر میں آج مجھ پر ہے ہولی۔	رباعی	پھرتے ہیں لئے عبیر بھر بھر جھولی
وعدے سے کیا کروگے دل خوش کبتک		ہولی کا قرار تھا، سو یہ بھی ہولی
ایک ہیں آشنا مرے غم خوار	مثنوی	پوچ گو بیوقوف بد اطوار
ان کی تعریف کیا کروں میں بیاں		کہتی شرماتی ہے گی منہ میں زباں
دل ہے ان کا کہیں دماغ کہیں		گھر میں ڈھونڈو تو بھونے بھانگ نہیں
منہ کو ان کے خدا نہ دکھلاوے		گر کوئی دیکھے خاک کیا کھاوے
چار پیسے کا سیر بھر ٹھرّا		پی کے رکھتے ہیں جی میں یہ غرّا
آج دنیا میں ہیں جو کچھ ہم ہیں		مالکِ چار دانگ عالم ہیں
دیکھتا ہوں جو ان کی میں صورت		یاد آتی ہے چین کی مورت
گال جبڑے سے یوں رہے ہیں لپٹ		لگ رہے ہوں کواڑ کے جوں پٹ
تس پہ چیچک نے یوں ہے ماری میخ		جوں جڑی ہوں کواڑ میں گُل میخ

ہیں تو کرتا نہیں سخن چینی
ناک ہے جوں کواڑ کی بینی

آنکھ گر ہے تو گھر سے باہر ہے
حلقۂ چشم حلقۂ در ہے

کان ایسے پڑے ہیں دونوں طرف
جوں ڈفالی کا ہوئے پھوٹا دف

منہ ہے سنڈاس کی طرح بدبو
لوگ کرتے ہیں دیکھتے اخ تھو

ان کے دھارے کو دیکھ کر فی الحال
جن کے دیکھے نہ ہوویں کالے بال

دیکھ نقاش اس کی پیشانی
کھینچتا دل میں ہے پشیمانی

کھوپڑی سر سے ہے گی یوں اٹکی
جوں کہ چولھے پہ اوندھی ہو مٹکی

توند لٹکے ہے پیٹ سے ایسی
پیٹ لتے ہووے پیٹ سے جیسی

صاف کہتا ہوں میں بہ مجبوری
ناف ہے جا ضرور کی موری

کیا کہوں اس کی اور بدحالی
منہ ہے چکنا تو پیٹ سے خالی

ولہ

دل لیکے زلف اس کی یوں حلقہ زن ہے مجھ پر
بیٹھا چمن میں ہووے جوں سانپ من کے آگے

ولہ

بتاں اُٹھاتے نہیں ہاتھ میرے کینہ سے
رہے ہے سنگ کتیں لاگ آبگینہ سے

ضرور کیا ہے کہ ہوتا ہے تو خجل ناصح
ہماری جیب کو ہے کیا لگائے رہنے سے

نہ اُٹھ سکے گا مرے لب سے حرف بوسہ کا
مٹا سکے ہے کوئی نام کو نگینہ سے

ایں ضعیف میں اتنا ہوا بقول فغاں
اٹک کے آہ نکلتی ہے میرے سینے سے

ولہ

کیا بُرا وقت تھا اس شوخ سے جب آنکھ لگی
جب تلک جیتے رہے روز نہ شب آنکھ لگی

بزم رنداں میں اسے دیکھ کے چھپ جاتے ہیں
کیا مگر شیخ کی ہے بنت عنب آنکھ لگی

ولہ

میں گندرا یار کے ملنے سے جاؤ جس کا جی چاہے
غرض اب شوق سے عاشق کہاؤ جس کا جی چاہے

حیاتِ جاوداں بخشے ہے تیغ آبدار اُس کی
اگر باور نہ آوے تو جا کے کھاؤ جس کا جی چاہے

ولہ

یار بھی اب گلہ لگا کرنے
یہ بھی اپنے نصیب کی خوبی

ہاتھ میں اپنا سر لئے رہنا
عشق کی پہلی یہ سلامی ہے

دل گرفتار کیوں نہ ہو میرا		بر میں جامہ ترے دو دامی ہے
زاہد کبھو تو گرد نہ پھر یو شراب کے	وله	یہاں آگ ہے چھپی ہوئی پردے میں آب کے
کیا چشم منعماں سے رکھیں مفلسانِ دہر		دریا نے تو بھرے نہیں کاسے حباب کے
پھرتا ہے کیوں بھٹکتا اے شیخ ہر طرف تو	وله	کہتا ہے جس کو کعبہ وہ یار کی گلی ہے
کہا کرتے ہو مجھ کو قابل جور و جفا یہ ہے	وله	جو کوئی چاہے کسی کو اے میاں اُس کی سزا یہ ہے
برہمن دیر کو پوجے ہے اور کعبہ کے تئیں زاہد		پرستش ہم جسے کرتے ہیں، وہ نام خدا یہ ہے
رشک گلزار ہوا داغ سے سینہ میرا	وله	یار کے بھاویں تماشا ہے، تماشا یہ ہے
اس ماہ رو کے سامنے آتی ہے چاندنی	وله	اپنے تئیں اب آپ ہنساتی ہے چاندنی
مُنہ دیکھو تیرے سامنے آ کر سفید ہو		ماٹی میں آبرو کو ملاتی ہے چاندنی
وہ دن کی چاندنی ہے پھر آخر اندھیری رات		ساقی پلا شراب کہ جاتی ہے چاندنی
گر آمد آمد اس مہ تاباں کے تئیں آئیں		کیوں چاندنی کا فرش بچھاتی ہے چاندنی
غیروں سے اختلاط ہماری بلا کرے	وله	گر آشنا کرے تو تجھی سے خدا کرے
دنیا میں کہنے کو سب ہی کہلاتے ہیں بھلے		پر ہے وہی بھلا، جو کسی کا بھلا کرے

۱۵- افسوس

افسوس تخلص، میر شیر علی نام، والد ماجد ان کے سید مظفر علی خاں، داروغہ توپ خانۂ نواب میر قاسم خاں عالیجاہ کے تھے۔ سلسلہ سیادت کا ان کی حضرت اسمٰعیل اعرج کو، کہ بڑے بیٹے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے تھے، پہنچتا ہے۔ وطن بزرگوں کا خاف ایک مکان ہے علاقہ میں عرب کے۔ بزرگوں نے ان کے ہندوستان میں آ کے نارنول میں سکونت اختیار کی۔ اس سبب سے وطن ان کا نارنول مشہور ہے۔ میر مذکور کے باپ اور چچا کو، کہ سید مظفر علی خاں اور سید غلام علی خاں نام رکھتے تھے، نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم

کی رفاقت میں سررشتۂ ملازمت کا نہایت اقتدار، اور عزّو وقار کے ساتھ توپ خانے کی داروغگی کے ساتھ سرفراز تھے، اور رسالہ معقول سے حضور میں مختار تھے۔ بعد شہید ہونے نواب عمدة الملک کے سیّد غلام علی خاں کو نیابت صوبہ الہ آباد کی بالذات بھی تھوڑے دنوں رہی آخر فالج بیماری سے انہوں نے سیر روضۂ رضوان کی کی۔ ان کی وفات کے بعد سید مظفر علی خاں خانہ نشین ہوئے، اور بارہ برس بے روزگار بیٹھے رہے۔ آخر نواب خان عالم بقاء اللہ خاں مرحوم نے لکھنو میں انہیں بلوایا، اور سرکار وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کے مشاہرہ میں تین سو روپے کا واسطے ان کے درماہہ ٹھہرایا۔ ان ایام میں میر شیر علی افسوس کا سن گیارہ برس کا یا کچھ کم زیادہ ہے، لیکن مولد ان کا دار الخلافہ شاہ جہان آباد ہے۔ یہ بھی ہمراہ اپنے والد ماجد کے لکھنؤ میں آئے، اور طور بود و باش کا یہیں ٹھہرائے۔ بعد کئی برس کے حسب الامر نواب صادق علی خاں کے، کہ بڑے بیٹے نواب میر محمد جعفر خاں صوبہ دار بنگالہ کے تھے، سید مظفر علی خاں وارد مرشد آباد ہوئے، اور داروغگی توپ خانہ وغیرہ کے ساتھ مورد عنایت و امداد ہوئے۔ آگے بیان ساتھ تفصیل کے بموجب طولِ کلام کا ہے۔ غرض جب وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر معہ صوبہ دار بنگالہ صاحبان عالی شان سے معرکہ آرا ہیں، تو سید مظفر علی خاں بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ بعد میر محمد جعفر خاں کی وفات کے روزگار نواب سیف الدولہ کا انہوں نے نہیں کیا، بلکہ لکھنؤ چلے آئے، اور بعد کئی برس کے حیدر آباد کی طرف گئے، وہیں وصال انکا ہوا۔ اس ایام میں میر شیر علی افسوس کا سن اُنیس ۱۹ برس کا تھا شعر و سخن کے ساتھ موانست ان کو بہ شدت تھی، اور طبیعت کو مناسبت نہایت۔ چنانچہ صغر سن سے شعر کہتے ہیں، اور اکثر اس شغل میں رہتے ہیں۔ اصلاح کا اتفاق ان کو میر حیدر علی حیران تخلص سے ہوا ہے، اور علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاگرد ان کو میر حسن حسن تخلص کا لکھا ہے۔ اس کی سند اپنے تئیں نہیں پہنچی، اور یہ خبر اپنے گوش زد نہیں ہوئی۔ ابتدا میں یہ سررشتہ روزگار کا نواب سالار جنگ مرحوم کے ملازموں میں رکھتے تھے۔ اور میرزا نوازش علی خاں، جو نواب مذکور کے بڑے بیٹے ہیں،

گیارہ برس ان کے متعینہ رہے۔ بعد برہم ہونے اس سررشتہ کے، صاحب عالم وعالمیان میرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کی عنایت اور قدردانی ازبسکہ حد سے زیادہ دیکھی، سعادت توسل کی انہوں نے ملازموں میں اس عالی جناب کے حاصل کی۔ جس ایام میں اس نیرّ اوج شہریاری کا خیمہ مغرب کی سمت نکلا، اور کوچ شاہ جہان آباد کو ہوا، تو میر مذکور بہ سبب بعضے بعضے عوارض کے رہ گئے، اور ساتھ نہ جا سکے۔ ایک مدت سے بتوکل وقناعت ہمراہی میں نواب سرفرازالدولہ بہادر کے دن زندگی کے بسر کر رہے تھے، کہ صاحبان والا مناقب عالی شان بارلو صاحب نے، مشورے سے عالی قدر سخن آفرین مسٹر گلگرسٹ صاحب، زباندان ریختہ لکھنؤ سے طلب کئے۔ بڑے صاحب نے لکھنؤ کے، کہ نامی اس معدن رافت کا ہر صاحب ہے، بہ عزت تمام ان کو بلوا کے، اور مشاہرہ دو سو روپے کا ٹھیرا کے، پانچ سو روپیا خرچ راہ دیا، اور کلکتے کی طرف روانہ کیا۔ چنانچہ جب مرشدآباد میں یہ آئے، تو وفور محبت سے اسی دن غریب خانہ میں تشریف لائے، کس واسطے کہ ان کے نکلنے کی تقریب سے دو مہینے آگے راقم حقیر لکھنؤ سے نکلا تھا، اور وارد مرشدآباد کا تھا، دیدار سے اپنے انہوں نے نہایت خوش وخرم کیا، اور چلتے ہوئے وعدہ کلکتے کی سیر کا اس عاصی سے لیا۔ غرض بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری میں، بلدہ کلکتے میں، صاحبان عالی شان کے ساتھ میر مذکور ملاقاتیں بہ عزت تمام رکھتے ہیں۔ اور گلستاں کے ترجمہ کا کمپنی کی سرکار سے کام رکھتے ہیں۔ راقم آثم سے ملاقات ایام شباب سے ہے۔ فی الحقیقت کہ ذات ان کی زمانے کے انتخاب سے ہے عجیب جوان خلیق اور اہل دل ہیں۔ فروتنی اور انکساری میں فرد کامل ہیں منطق ومعانی کے بیان میں صاحب استعداد ہیں۔ کلیات اور معالجات فن طبابت کے بھی بخوبی یاد ہیں۔ شعر عاشقانہ بہت مزے سے کہتے ہیں۔ اقسام نظم ہیں +

کیوں نہ ہو گھمنڈ اس بت پُرغرور کو — صبر کسی طرح نہیں اس دل ناصبور کو
اس بت نے حجاب کا دیویں ابھی اُٹھا نقاب — دیکھ سکے گا پر اسے تاب ہے اتنی طور کو
پانی نہیں فقط نہیں ڈوبی ہے سب کی زمیں — دیکھنا آج ہم نشیں آنسوؤں کے وفور کو
سچ ہیں یہ خود نمائیاں، حق ہیں یہ لن ترانیاں — شعلۂ طور بجھ گیا دیکھ کے اس کے نور کو

ناز بھرا وہ مُنہ، گر دیکھے جو اک نظر تو بھر		مُنہ پہ نہ لائے زاہدا بھولے سے ذکرِ حور کو
دو کسو نہ طعنہ زن مجھے تا کسوں کی خوشامدیں		میں تمھی کی نہیں فقط، کرتے ہیں سب غرور کو
تو نے افسوس کیا کیا، دشمنِ جاں کو دل دیا		یہ تیری عقل جل بجھے، آگ لگے شعور کو
سمند گرم جو یہاں اس سوار کا پہنچا	وله	غبار تا فلک اس خاکسار کا پہنچا
تو سچ بتا کہ تجھے اتنی کیوں ہے بےچینی		مگر پیام کسی بےقرار کا پہنچا
ملے ہے پانو سے اپنے وہ لالہ رو ہر دم		یہ مرتبہ تو دلِ داغ دار کا پہنچا
ہے یہاں تلک تو نزاکت گلوں کے گجرے سے		لچکنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہنچا
قفس سے چھٹنے کی اُمید ہی نہیں افسوس		حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا
جب تلک نہ عشق یارو، نہ دلِ ناکام تھا	وله	اپنے میں کیا چین تھا، اور دل کو کیا آرام تھا
بخشیو ہم کو تمھے ٹوکا ہے ہم نے بھول کر		دردِ دل تیری بلا ہو، وہ ترا ہمنام تھا
اس کے اُٹھتے ہی جی پہ آن بنی	وله	دیکھئے آگے آگے کیا ہوگا
صبح نت کرتا ہے یہ دل اشکباری بیش تر	وله	ہو سحر کو خانۂ ماتم میں زاری بیش تر
دل کے تئیں بھی آشنائی کا نہیں کچھ اعتبار		بے وفاؤں سے رہی ہے تجھ کو یاری بیشتر
ہنس کر کسی سے میں نے نہ کی بات تجھ بغیر	وله	روتے ہی آہ کٹ گئی یہ رات تجھ بغیر
غیروں سے تو ملے تو ملا کر؛ وَلے مجھے		کرنی نہیں کسی سے ملاقات تجھ بغیر
بزم میں اس کی نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں	وله	چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا مُنہ تکتے ہیں
کہا میرا مطلق نہیں مانتا ہے	وله	تو جیسا ستاتا ہے جی جانتا ہے
کوئی دل سے مرے پوچھے جیسا ہے وہ اے ناصح	وله	تجھ کو نہ خوش آیا یہ، پر مجھ کو تو بھاتا ہے

۱۶- آشفتہ

آشفتہ تخلص، حکیم رضا قلی خاں نام، والد ماجد ان کے حکیم محمد شفیع محمد خاں مرحوم تھے،

متوطن اکبر آباد کے۔ بڑے بھائی ان کے میرزا ہجو صاحب، خدا مغفرت کرے، ذرہ تخلص کرتے تھے عجب ولولے اور ذوق شوق کے ساتھ کربلائے معلےٰ گئے، اور وہیں خاک ہوئے، روبرو ضریح مقدس کے دفن ہیں۔ حق سبحانہ تعالےٰ حشر بھی ان کا، اور جمیع مومنین کا، جناب سید الشہدا علیہ السلام کے ساتھ کرے۔ دوسرے بھائی ان کے، میرزا رضی صاحب، وہ بھی ان سے بڑے ہیں، بالفعل لکھنؤ میں داد طبابت اور معالجے کی دے رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ جو جو اختراعات فن طبابت میں انہوں نے کئے، دیکھنے کا کیا دخل ہے، کسی نے نہیں سنے۔ حذاقت اور لیاقت ان کے خاندان کی نہیں ہے محتاج تشریح اور بیان کی۔ ہمیشہ بزرگ ان کے معالج سلاطین نامدار کے رہے ہیں، اور امیروں سے بلکہ وزیروں سے سدا ناز و اعزاز کیا کئے ہیں۔ غرض حکیم رضا قلی خاں آشفتہ تخلص راقم آثم کے دوستان قدیم سے ہیں۔ جوان آزاد وضع، اور خوش اختلاط و آراستہ مزاج، اور مایۂ ارتباط میں محبت، اور یکرنگی میں خلاصے، اور آشنائیوں کے بہت خاصے حسن پرستی میں خود لیلی و شیریں کی تصویر، اور عشق بازی میں قیس و فرہاد کے پیر ہیں۔ مشورہ سخن کا انہوں نے میر سوز صاحب سے کیا ہے، لیکن شاگردوں میں ان کے اتنا کوئی نہیں ہوا ہے۔ میر صاحب مذکور کے طرز ادائیہ میں انہوں نے رنگینی کچھ اور بھی زیادہ کی ہے، سچ تو یہ ہے کہ رنگین ادائی کی داد دی ہے۔ چندے انہوں نے رفاقت میرزا محمد تقی خاں کی کی، جو کہ پوتے میرزا یوسف کور کے تھے، اس سبب سے دو ڈھائی برس بود و باش ان کی فیض آباد میں ہوئی تھی، وگرنہ پرورش انہوں نے لکھنؤ میں پائی ہے، اور کیفیت زندگی کی وہیں اٹھائی ہے۔ سنہ ۱۲۰۸ھ بارہ سو آٹھ ہجری میں لکھنؤ سے مرشد آباد میں آئے، نواب مبارک الدولہ ناظم صوبہ بنگالہ مرض الموت میں گرفتار تھے، اگرچہ معالجہ میں انہوں نے رنگ مسیحائی کے دکھلائے، لیکن قضا و قدر سے لاچار تھے۔ بعد نواب مبارک الدولہ کی وفات کے، خلف الصدق سے ان کے، یعنی نواب عضد الدولہ ناصر الملک سید بابر علی خاں بہادر دلیر جنگ سے، نہایت موافقت آئی، اور صحبت نے بہ شدت یک رنگی پائی۔ چناں چہ سات برس کامل ان کی خدمت میں رہے،

اور قریب لاکھ روپے کے بنگالہ میں پیدا کئے، لیکن خرچ کرنے والے بھی ایسے ہی بلائے روزگار تھے، کہ جس دن مرشدآباد سے نکلے تو قرض دار تھے۔ غرہ ذی حجہ کو ۱۲۱۴ھ بارہ سو چودہ ہجری میں اپنے ہی مزاج نازک سے، ناحق روزگار چھوڑ کلکتے میں چلے آئے، اور زمانے کی بے رنگی کو مطلق خیال میں نہ لائے، بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، بہ عزت تمام کلکتے میں اوقات بسر کرتے ہیں، اور اک رنگ کی صحبتوں میں دن رات بسر کرتے ہیں۔ طبیعت ان کی موسیقی کی طرف لڑکپن سے ہے، اور ایک مناسبت بھی بھلی چنگی ان کو اس فن سے ہے۔ اپنی آشفتہ مزاجی میں غزلوں کو انتظام نہیں دیا ہے، وگرنہ مدت سے ایک دیوان کا سرانجام ہو چکا ہے۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں ۔

جی تھا آنکھوں میں یار تھا دل میں — یہاں تلک انتظار تھا دل میں
آبلہ ہو کے دم میں پھوٹ بہا — یہ کہاں کا بخار تھا دل میں
مر گئے پر بھی، ہم کو خاک نہ دی — آج تک یہ غبار تھا دل میں
کھینچتے ہی ٹک اے کمان ابر — تیر مژگاں دو سار تھا دل میں
دم آخر جو ہچکی آتی تھی — وہ فراموش گار تھا دل میں
دست و لب نزع میں جو ہلتے تھے — شوق بوس و کنار تھا دل میں
دم شماری تلک بھی آشفتہ — قدموں کا شمار تھا دل میں

ولہ

فقط نہ اپنی ہی تم آن دیکھتے جاؤ — ادھر اُدھر بھی مری جان دیکھتے جاؤ
نہ پیچ و تاب کو بالوں کے طول دو اتنا — ہمارا دل ہے پریشان، دیکھتے جاؤ
بجائے اشک نکلتے ہیں پارہائے جگر — تمہارے جی میں تھا ارمان، دیکھتے جاؤ
دکھانے آئے تھے دامن کے چاک کی خوبی — ہمارا چاک گریبان، دیکھتے جاؤ
کیا خرید زلیخا نے مصر میں یوسف — جنابِ عشق کی تم شان دیکھتے جاؤ
اگرچہ ہوویں گی تصدیع لیکن آشفتہ — کوئی گھڑی کا مہمان، دیکھتے جاؤ

وصل اس کا خدا قریب کرے — وله — دیکھیں، تب ہم سے کیا رقیب کرے
ہجر سے قتل، وصل سے احیاء — حسب میں جو آوے، سو طبیب کرے
گُل کا دیکھا چٹک کے چپ ہونا — شور کیوں کر نہ عندلیب کرے
مرگیا ایک صنم پر آشفتہ — موت ایسی خدا نصیب کرے!

یہ خرابی تو پڑی مجھ پہ ترے جانے سے — وله — چغد بھی ڈرنے لگے اب مرے ویرانے سے
کس طرح قید کروں، یہ تو ٹھہرتا ہی نہیں — کون بر آوے بھلا، اس دل دیوانے سے؟
میں سمجھتا ہوں کہ تم جا کے نہیں آنے کے — فائدہ کیا ہے بھلا جھوٹ قسم کھانے سے
شعلہ خو! آگے تو اتنا نہ جلاتا تھا مجھے — آج تو آگ ہوا غیروں کے بھڑکانے سے
دیکھتے ہی اُسے کل میرے یہ اوسان گئے — اپنے بیگانے وہاں جتنے تھے سب جان گئے
اپنے کے ہوتے بھلا غیر کو صدقے تو نہ کر — ہم بھی جی رکھتے ہیں پیارے، ترے قربان گئے
مجھ کو کہتا ہے صنم، تجھ کو بھی اب آگ لگے — وله — آنکھ سے آنکھ ملاتا ہے، تجھے آگ لگے
بوسہ کے واسطے چپٹا، تو لگا کہنے مجھے — بس کہیں دور بھی ہو، مُنہ کو ترے آگ لگے

باب البا

ا۔ بیدل

بیدل تخلص، میرزا عبدالقادر نام، قوم چغتا، لیکن نشو و نما انہوں نے ہندوستان میں پائی ہے، جودتِ ذہنِ سلیم، اور ذکائے طبعِ مستقیم، کے باعث تصویر نازک خیالی کی بہت نکہ سکھ کی کھینچ کر باریک بینوں کو دکھائی ہے۔ بیشتر اختراعات انہوں نے زبان فارسی میں کئے ہیں، لیکن اہلِ محاورہ کے مقبول نہیں ہوئے ہیں۔ آسماں جاہ محمد اعظم شاہ کے ساتھ توسل رکھتے تھے، اور موردِ الطاف و عنایت شاہزادۂ عالم و عالمیان کے رہتے تھے۔ قوت جسمانی اور طاقت بدنی قادر قوی نے اتنی انہیں عنایت فرمائی تھی، کہ اوران کے معاصرین کے حصہ میں کم آئی تھی

چناں چہ اک روز رکاب میں شاہزادے کی عین سواری کے دوادوش میں ایک شیر نکل آیا، اور کئی بیچاروں اجل کے ماروں کو ذائقہ مرگ کا اس نے چکھایا۔ آخر میرزائے مذکور کے ہاتھ سے بکری کی طرح مارا گیا، اور اپنی جان سے بیچارہ گیا۔ دفعتاً ایسے ردی خلائق سے یہ بیزار ہوئے، کہ روزگار پاکشیدہ، اور دنیاداری سے دست بردار ہوئے۔ طریقہ فقر اور گوشہ نشینی کا اختیار کیا، دل کو فراغ یاس اور خونِ تمنا سے رشکِ گلزار کیا، لیکن دروازہ ان کا کثرت اعتقاد سے مسجودِ خاص و عام تھا، اور بوسہ گاہ امیرانِ عظام تھا۔ نواب نظام الملک صوبہ دار دکھن کا خط مکرر اور متواتر اس مرکزِ دائرہ قناعت کی تحریک میں آیا، لیکن قطب آسمانِ توکل نے حرکت کو قبول نہ فرمایا۔ ایک بیتِ فارسی نظام الملک کے جواب خط میں لکھی ہے، اس سے قناعت اور جواں مردی اس شیر بیشۂ استغنا کی معلوم ہوتی ہے +

اس بیت کو بہ سبب زبان فارسی کے حاشیہ[۱] پر لکھا ہے، اور ترجمہ اس کا اس طرح داخل کتاب کیا ہے +

کب عوض دنیا کے سرکوں، جا کے چھوڑوں ٹھاؤں کو باندھی ہے مہندی قناعت کی میں اپنے پانو کو

کُلیات ان کا ازروئے نظم و نثر کے قریب لاکھ بیت کے مشہور ہے، لیکن اہل دنیا کی تعریف کہیں ایک مصرع میں نہیں مذکور ہے۔ بحر متدارک اور کامل وغیرہ پانچوں وزن، جن کے ناظم مخصوص شعرائے عرب ہیں، اور عجم ان سے احتیاط کرتے سب کے سب ہیں، اکثر میرزا نے غزل ان اوزان میں کہی ہے، اور داد نازک خیالی کی دی ہے۔ ازبس کہ مدار دنیائے دوروزہ کا فنا پر ہے، ۱۱۳۳ھ گیارہ سو تینتیس ہجری میں بلدہ شاہ جہان آباد کے اندر اس سرائے فانی سے عالم باقی کی طرف توجہ فرمائی۔ ان دو بیتوں نے، زبان ریختہ میں اس قادر سخن کے نام سے شہرت ہے پائی +

مت پوچھ دل کی باتیں، وہ دل کہاں ہے، ہم ہیں	اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے، ہم ہیں
[۱] دنیا اگر دہند، نہ جنبم زجائے خویش	من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا		پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے، ہم ہیں

۲- بیان

بیان تخلص، احسن اللہ خاں نام، شاگردوں میں سے میرزا مظہر جان جاناں کے تھا سکونت دلّی میں اختیار کی لیکن متوطن اکبر آباد کا تھا۔ شاگردوں میں سے میرزائے مذکور کے عاشق مزاج اور شیریں زبان تھا۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان تھا۔ یہ اشعار منتخب دیوان اس سخنور خوش بیان کے ہیں +

وہ بھی کیا دن تھا کہ ہم آغوش ہم سے یار تھا		در کے باہر مدعی جوں صورتِ دیوار تھا
اس تجاہل پر پڑا میں یہ سمجھتا ہوں گو میں		وہ کہ جن کی چشم کا میں عمر بھر بیمار تھا
دیکھ کر تابوت کو، بیمار داروں سے مرے		پوچھنے لاگا کہ اس مردے کو کیا آزار تھا
کوئی کسی کا بیان، آشنا نہیں دیکھا	ولہ	سوائے اس کے ان آنکھوں نے کیا کہیں دیکھا
اگر جوں ہی قاصد نے لیا نام کسی کا	ولہ	اس نام کے سنتے ہی ہوا کام کسی کا
کیوں آج سماتا نہیں اپنے میں خوشی سے		کیا تجھ کو بیاں پہنچا ہے پیغام کسی کا
عالم کو تاج و گوہر و تخت دلوا دیا	ولہ	اے آسمان بنا تو، مجھے تو نے کیا دیا
نے دین سے اطلاع ہے، نہ دنیا کی کچھ خبر		اس عشق نے غرض ہمیں سب کچھ بھلا دیا
ایسے ہی میرے بخت جو ماتے تھے نیند کے		خواب عدم سے کاہے کو مجھ کو جگا دیا
کب تلک اس کی شکایت ہو نہ لب سے آشنا	ولہ	ایک بیگانہ ہے مجھ سے، اور سب سے آشنا
غیر کے کہنے پہ مت بیگانہ ہو یکبارگی		دیکھ تو اے شوخ! میں تیرا ہوں کب سے آشنا
ہم دم نہ فکر کر، کہ مرا کام ہو چکا	ولہ	گر دل مرا یہی ہے، تو آرام ہو چکا
آتا ہے تجھ کو ننگ، مرے نام سے عبث		اے شوخ! اب تو شہر میں بدنام ہو چکا
اگر اک صبح دم آتا وہ اٹھ کر خواب شیریں سے	ولہ	ہمارا کیا گریباں، ناصحوں کا پیرہن پھٹتا

جگایا مجھ کو کس کم بخت نے ہائے!	ولہ	مری آنکھوں کے آگے وہ ابھی تھا
تو تو ساقی جام ترسا کر پلاتا تھا مجھے	ولہ	یار کی آنکھوں نے مجھ کو کر دیا یکبار مست
رو کر اس سے میں کہا، مرتا ہے یہ بیمار آج	ولہ	مسکرا کر وہ لگا کہنے، کہ اس کا کیا علاج
یہ آرزو ہے کہ وہ نامہ بر سے لے کاغذ	ولہ	بلا سے پھاڑ کے پھر ہاتھ میں ملے کاغذ
وہ کون دن ہے کہ غیروں کو خط نہیں لکھتا		قلم کے بن کو لگے آگ! اور جلے کاغذ
عرش تک جاتی تھی، اب لب تک بھی آ سکتی نہیں	ولہ	رحم آتا ہے بیاں اب مجھ کو اپنی آہ پر
اک بار فوج عشق پڑے مجھ پہ ٹوٹ کر۔	ولہ	لے کے قرار و دین و دل و ہوش لوٹ کر
لینا اگر ہے دل کو، تو لے بھی اسے کہیں		سینہ میں اب تلک تو رکھا مار کوٹ کر
ہم سرگذشت کیا کہیں اپنی، کہ مثلِ خار		پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر
کیا ایسے سے دردِ دل کو کہئے	ولہ	اِدھر تو سُنا، اُدھر فراموش
میں بس کہ خاک میں ترے کوچے کی مل گیا	ولہ	تس پر بھی تیرے دل میں ہے مجھ سے غبار حیف
تمنا بادشاہی کی کسی سفلہ کو ہووے گی	ولہ	مرے دل میں خدائی کا بھی خطرہ ہو، تو کافر ہوں
کافر ہو، جس کے دل میں کچھ اور آرزو ہو	ولہ	اک مختصر سی جا ہو، میں ہوں، اور تو ہو
مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی	ولہ	جس طرح کٹا روز، گذر جائے گی شب بھی
آخر تو شکایت سے مجھے منع کرے ہے		سی دیجیو ٹک ہاتھ سے اپنے مرے لب بھی
جہاں روؤں تمنا میں تری اے شمع رو پیارے		اُوگے اس گُل زمیں سے حشر تک جوں لالہ انگارے
قمارِ عشق کی بازی بھی کچھ دنیا سے باہر ہے	ولہ	اُسے کہتے ہیں عاشق، جو کوئی یہاں نقدِ جاں ہارے
آنسوؤں تک پونچھنے کی غیر کے تدبیر ہے	ولہ	مجھ سے اتنا بھی نہیں کہتا، کہ کیوں دل گیر ہے
چرخ کی برہم زنی سے یہ تعجب ہے بیاں		لیلیٰ و مجنوں کی یک جا اب تلک تصویر ہے
شب فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے	ولہ	یہی ہے صبح سے دھڑکا، کہ رات آتی ہے
جا کہو کوئے یار میں کوئی ۔ ۔	ولہ	مرگیا انتظار میں کوئی

وہ بھی کیا رات تھی کہ سوتا تھا		سر رکھے اس کنار میں کوئی
جادو تھا، کہ سحر تھی، بلا تھی،	وله	ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی
کیدھر ہے، کہاں ہے، ناخوشدلی تو		ہم سے کبھو تو آشنا تھی
رسوا ابھی سے کرتی ہوائی چشم تر مجھے	وله	آنا ہے اس کی بزم میں بارِ دگر مجھے
آیا ہوں اس گلی سے ابھی، دم نہیں لیا		پھر لے چلا ہے یہ دل وحشی اُدھر مجھے
کُنج قفس سو امری قسمت میں جانہ تھی		تو کیوں دیئے فلک نے میاں بال و پر مجھے
جھگڑتے تجھ سے پیارے حجاب آتا ہے	وله	وگرنہ بات کا تیری جواب آتا ہے
پیو شراب جوانو! کہ موسم گل ہے		ہمیں بھی یاد وہ عہد شباب آتا ہے
اپنے دل سے بھی عداوت ہو گئی ہے اب مجھے		دشمنِ جانی ہے میرا، جو کوئی چاہے ہے مجھے
کوئی بجز قیس نہ دیوانہ ہوا لیلی کا		میں ترے عہد میں دیکھوں ہوں جدھر مجنوں ہے
کیا زلف میں اُس شوخ کے تھی دل کی صبح	وله	یا شام سے پھولی تھی کسی شب کی صبح
ٹک زلف کو میں ہاتھ لگایا، کہ ادھر		ہمسایہ پکارا، کہ ہوئی کب کی صبح
جس وقت کہ بیدار وہ ہوتا ہیں گا	رباعی	عالم کی غضب سے جان کھوتا ہیں گا
غنچوں کو صبا کہیو، کہ آہستہ کھلیں		زانو پہ مرے وہ شوخ سوتا ہیں گا
مت کہیو بیاں جام اجل پیتا ہے	رباعی	یا اُس کے لئے کوئی کفن سیتا ہے
یارو جو مرے حال کو پوچھے وہ شوخ		اتنا کہیو، کہ اب تلک جیتا ہے
سو طرح سے یہ عشق لبھاتا ہے مجھے	رباعی	ہر چیز میں یک جلوہ دکھاتا ہے مجھے
کس ماہ کا یہ عکس پڑا ہے یارب!		ہر چاہ میں یوسف نظر آتا ہے مجھے
کہتا ہوں جناب حق میں ڈرتے ڈرتے	رباعی	مدت گذری دعا ہی کرتے کرتے
ہے اُس کو یہ قدرت کہ بیاں سا محروم		منہ یار کا دیکھ لیوے، مرتے مرتے

۳۔بقا

بقا تخلص، محمد بقا نام، بیٹا حافظ لطف اللہ کا، شاگردوں میں سے میرزا فاخر مکین تخلص کے تھا۔ فی الحقیقت عزیز نکتہ سنج، و باریک بیں، و معنی بند، و سخن آفرین تھا۔ میرزا رفیع سودا تخلص کے منہ اکثر چڑھا، اور اس نہنگ بحر معانی کے ہجو میں کچھ کچھ واہیات مکرر بکا، لیکن میرزائے مرحوم نے مطلق اعتنا نہ کی، اور یہ بات کہی کہ میں نے جس کی ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور ہے، سو تیری ہجو نہ کروں گا، کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے۔ غرض اس عزیز سے زمانے نے موافقت کبھی نہ کی، اور صورت روزگار کی بیچارے نے آئینے میں خیال کے بھی نہ دیکھی۔ افلاس سے تنگ آ کر کسی کے کہے سے کچھ اعمال تسخیر کواکب کے شروع کئے تھے۔ خیال میں اس سودائے خام کے مجنون ہوئے، اور جب تک جئے سودائی رہے۔ سنہ ۱۲۰۰ بارہ سو چھ ہجری تھی، کہ حالت میں سودائی کے یہ بات سوجھی، کہ تحصیل دولت عقبیٰ کی کیجئے، اور خاک راہ سے کربلاء معلّا اور نجف اشرف کے دیدۂ دل میں سرمۂ حق نما دیجئے۔ یہ عزم کر کے جہاز پر سوار ہوئے، اور منزل مقصود کی طرف قدم گذار ہوئے۔ اثنائے راہ میں اس دار فنا سے، موافق نام اپنے کے، سفر ملک بقا کا کیا۔ خوشا یہ حال کہ انجام تو بہ خیر ہوا +

یہ چند شعر اس راہ رو جادۂ بقا کے گوشۂ خاطر میں تھے، سو لکھے جاتے ہیں +

یاد میں تڑپے ہے دل اس ابروئے خمدار کی		آج کچھ ناخن بدل ہے آہ! اس بیمار کی
دیکھئے، ہیں منصب مجنوں = یہ لیلیٰ صفتاں	ولہ	خاک میں ہم کو ملا، کس کو سرفراز کریں
کیا خط لکھیں اُس کو حرکت ہاتھ سے گم ہے	ولہ	خامہ مرے اب ہاتھ میں انگشت ششم ہے
کس نے چمن میں ریختہ کیا خندۂ لب کو	ولہ	غنچے رہے ہیں دانتوں میں داب اپنی جیب کو
اس لب سے کچھ نہ چوسے قدح، اور قدح سے ہم	ولہ	تو کیوں ٹلے سبو سے قدح، اور قدح سے ہم
پاتے ہیں میکدے میں بقا روز فیض سے		خم سے سبو، سبو سے قدح، اور قدح سے ہم

۴- بیدار

بیدار تخلص میر محمدی نام، شاہ جہان آبادی، دوستوں میں سے خواجہ میر درد تخلص کے تھے۔ نزاکت سے معنی کے بخوبی آشنا، اور زباندانان دلی سے ہمیشہ ہم نوا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کلام اپنا انہوں نے اصلاح کی تقریب سے خواجہ میر درد کو دکھایا ہے۔ اور اُس نقادِ بازارِ معانی سے فایدہ بہت سا اُٹھایا ہے۔ زبان ریختہ میں صاحبِ دیوان ہیں۔ کچھ اشعار منتخب ان کے دیوان کے لکھے گئے یہاں ہیں ✦

تو نے جو مدتوں میں اِدھر کو گذر کیا		نالے نے آج کچھ تو ہمارے اثر کیا
غیرت نہ آوے تجھ کو ستمگر ہزار حیف		جس دل میں تو مقیم تھا وہاں غم نے گھر کیا
ہم غافلوں کی آہ نہ اودھر نظر گئی		اُس نے ہزار اپنے تئیں جلوہ گر کیا
اس کھیل سے کہ اپنی مژہ کو کہ باڑ ٹے		عالم کو نیزہ بازی سے زیر و زبر کیا
دیوانے کو پری سے پھر اب کر دیا دوچار		اے آنکھوں کیا کیا مرے جی کا ضرر کیا
کیدھر ہے تو کہاں ہے اجابت کہ بارہا		میں نے بلند دستِ دعا ہر سحر کیا
بیدار ایسے رونے سے امان بار آ		دامان و آستیں کو تو لوہو سے تر کیا
آنکھوں میں چھا رہا ہے ازبسکہ نور تیرا	ولہ	ہر گل میں دیکھتا ہوں رنگِ ظہور تیرا
بیدار وہ تو ہر دم سو سو کرے ہے جلوہ		اُس کو جو تو نہ دیکھے ہیگا قصور تیرا
جب کہا میں نے کہ اے سروِ ریاضِ خوبی	ولہ	کس کا تو آفتِ جاں ہے تو کہا تجھ کو کیا
کہنے لاگا دلِ گم گشتہ ہے تیرا مجھ پاس		جب کہا میں نے کہاں ہے تو کہا تجھ کو کیا
یہ کون پئے شکار نکلا	ولہ	ہر دل ہو اُمیدوار نکلا
جینے کی نہیں ہے آس مجھ کو		تیر اُس کا جگر کے پار نکلا
ہم خاک بھی ہو گئے پر اب تک		دل سے نہ ترے غبار نکلا

جب بام پہ بے نقاب ہو کر		وہ صبح کو ایک بار نکلا
اُس روز مقابل اُس کے خورشید		نکلا بھی تو شرمسار نکلا
نالہ ہر چند ہم نے کر دیکھا	وله	آہ اب تک نہ کچھ اثر دیکھا
آج کیا جی میں آگیا تیرے		متبسّم ہو جو ادھر دیکھا
ہے بیدار کی آنکھوں سے ساقی اشک سرخ ایسے	وله	مے گلگوں کا کوچہ میں گویا تیرے سبو ٹوٹا
سبزۂ خط ترے عارض پہ نمودار ہوا	وله	حیف اس آئینۂ صاف پہ زنگار ہوا
آج آتا ہے نظروں مری آنکھوں میں سیاہ		رات اس زلف میں دل کا گرفتار ہوا
کھینچ کر زلف کی تصویر کو خط میں بھیجوں	وله	تا کہ معلوم کرے حال پریشان ہوا
اے شانہ کھولیو گرہ زلف سوچ کر	وله	دل سیکڑوں ہیں اس میں گرفتار دیکھنا
ہم چشم ابر دیدۂ تر گرچہ ہو سکا۔	وله	لیکن غبار غم ہے دل سے نہ دھو سکا
ہوا اب کے چھوڑے مجھے غم تری جدائی کا	وله	تمام عمر نہ لوں نام آشنائی کا
اُگے ہے پنجۂ مرجاں مزار سے اُس کے		شہید ہو جو کوئی اس کف حنائی کا
مرے قدم سے لگے ہے سر سبز بوستان جنوں		ہر ایک آبلہ گل ہے برہنہ پائی کا
کہو تو کس سے میں پوچھوں نشان خانۂ دوست	وله	کہ آشیانۂ عنقا ہے آستانۂ دوست
حال کن سن کے ہنس دیا میرا	وله	کچھ تو آیا ہے مہربانی پر
آج ساقی دیکھ تو کیا ہے عجب رنگیں ہوا	وله	سرخ مے کالی گھٹا اور سبز ہو مینا کا رنگ
اس سے دو چار ہو گئے ہم	وله	سوچی سے نثار ہو گئے ہم
فتراک میں باندھ خواہ مت باندھ		اب تیرے شکار ہو گئے ہم
آ تیری گلی میں مر گئے ہم	وله	جی تھا سو نثار ہو گئے ہم
خاک عاشق ہے جو ہوتی ہے نثار دامن	وله	اے مری جان تو مت جھاڑ غبار دامن
خلش خار رہ عشق سے اب اے ناصح		نہ رہا ایک بھی ثابت مرا تار دامن

ہم ترے اس دلِ نازک سے خطر کرتے ہیں
ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں

وله

شبِ ہجراں میں نہ پوچھو کہ میں کیا کرتا ہوں
صبح تک شمع کی مانند جلا کرتا ہوں

وله

صورت اس کی سما گئی دل میں
آہ کیا آن بھا گئی دل میں

وله

تم کو کہتے ہیں کہ عاشق کا فغاں سنتے ہیں
یہ تو کہتے ہیں کہ باتیں ہیں کہاں سنتے ہیں

وله

اُٹھ گیا ہم سے گو کدر ہو
خوش رہے وہ جہاں ہو جیدھر ہو

اس سے بیدار بات تو معلوم
دیکھنا بھی کہیں میسر ہو

وله

تعجب ہے کیا ناتوانی سے میری
کہ فصاد شرمندۂ نیشتر ہو

وله

دل کو کرتا ہے نگاہوں میں شکار
واہ وا ہے تری صیادی کو

دیکھ آکر مری آنکھوں کی بہار
کر دیا باغ ہر اک وادی کو

وله

تری مجلس میں اگر ہو گذرِ پروانہ
نہ پڑے شمع پہ ہرگز نظرِ پروانہ

ہے زمانہ سے جدا روز و شبِ سوختگاں
شام کہتے ہیں جسے ہے سحرِ پروانہ

بوسۂ شمع کو جلنے کے بہانے آیا
دیکھو اے بزم نشیناں ہنرِ پروانہ

قید سے شمع کی ممکن نہیں چھوٹے بیدار
رشتۂ شمع سے باندھا ہے پرِ پروانہ

وله

دیکھ تجھ کاکلِ مشکیں کی ادائیں شانہ
دونوں ہاتھوں سیتی لیتا ہی بلائیں شانہ

اُس کے بھر آئے ترے مرہم کاکل سے زخم
ہاتھ اُٹھا کیوں نہ کرے تجھ کو دعائیں شانہ

ایک دن گر نہ ملی تجھ سے تو آشفتہ ہوئی
دیکھ لے کاکلِ مشکیں کی وفائیں شانہ

وله

تھم گیا اشک شبِ ہجر میں روتے روتے
سحرِ وصل کو مدت ہوئی ہوتے ہوتے

مردمِ چشم سے پوچھ اے مہ تاباں تجھ بن
کون سی شب کہ نہ گذری مجھے روتے روتے

وله

کیوں کر عاشق سے بھلا کوچۂ جاناں چھوٹے
بلبل زار سے کیوں کر کہ گلستاں چھوٹے

کس کے آگے میں کروں چاک گریباں کہ تو
جو ترے ہاتھ سے ناصح مرا داماں چھوٹے

وله

عاشق کا اگر دیدۂ خونبار نہ ہووے
تو رشکِ چمن کوچۂ دلدار نہ ہووے

بخشی ہے جسے تجھ نرگسِ چشم نے مستی		وہ مست قیامت کو بھی ہشیار نہ ہووے
بیجا ہے شکایت ستم یار کی بیدارؔ		ممکن ہے کہ معشوق دل آزار نہ ہووے
نہ وفا ہے نہ مہر و اُلفت ہے	ولہ	اے ستمگر یہ کیا قیامت ہے
گلِ صد برگ دیکھ اس کے ہاتھ		دلِ صد چاک کی کنایت ہے

جس دن تم آکے ہم سے ہم آغوش ہوگئے	ولہ	شکوے جو دل میں تھے سو فراموش ہوگئے
کہاں ہے تو کہ میں کھینچوں ہوں راہ میں تیری	ولہ	برنگِ نقشِ قدم انتظار آنکھوں سے
ابتک مرے احوال سے وہاں بیخبری ہے	ولہ	اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے
فولاد دلاں چھوڑیو زنہار نہ مجھ کو	ولہ	چھاتی مری جوں سنگ شراروں سے بھری ہے
کس باغ سے آتی ہے بتا مجھ کو کہ یہ آج		کچھ اور ہی بو تجھ میں نسیمِ سحری ہے
لبِ رنگیں ہیں ترے رشکِ عقیقِ یمنی	ولہ	زیب دیتی ہے تجھے نامِ خدا کم سخنی
ہار پہرے تھے جو پھولوں کے نشاں ہے ابتک		ختم ہے گلبدنوں میں تری نازک بدنی
نشہ میں جی چاہتا ہے بوسہ بازی کیجئے	ولہ	اتنی رخصت دیجئے بندہ نوازی کیجئے
زاہد اس راہ نہ آمست ہیں میخوار کئی	ولہ	ابھی یہاں چھین لئے جبہ و دستار کئی
کف پا ہیں ترے صحرا کی نشانی بیدارؔ		مرگیا تو بھی پھپھولوں میں رہے خار کئی
میر مجلس رنداں آج وہ شرابی ہے	ولہ	خون دل جس سے مرا بادۂ گلابی ہے
ترے اے پری پیکر سینہ پر نہیں پستاں		طاق حسن پہ گویا شیشۂ حبابی ہے
دوستو جانے دو اب ہاتھ اُٹھاؤ ہم سے	ولہ	یہ ہے وہ زخم کہ بہ ہو نہ کسی مرہم سے
مہرباں خیر تو ہے کس پہ یہ غصہ کیجے		آج آتے ہو نظر کچھ تو مجھے برہم سے

جو کچھ چاہئے آپ فرمائیے	ولہ	پہ غیروں کی باتیں نہ سنوائیے
ڈراتے ہو کیا قتل کرنے سے ہم کو		اگر یوں ہی جی میں ہے آجائیے
بیدار رواں ہے اشک دریا دریا	رباعی	بتلا تو کہ ہے دیدۂ تر دریا دریا

رونے سے ترے تمام خانہ ہی خراب	حیراں ہوں میں اس میں ہی گھر بہا دیا

۵۔ بسمل

بسمل تخلص، سید جبار علی نام، متوطن جبار کھڑکی۔ چند مدت انہوں نے عظیم آباد میں گذر کئے ہیں، اور تھوڑے سے دن مہاراجہ جیت سنگھ، بنارس کے راجہ، کی وکالت میں اوقات بسر کی ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ سنہ ۱۱۹۶ گیارہ سو چھیانوے ہجری میں میر مذکور سے بلدۂ محمد آباد و بنارس میں مکرر اتفاق ملاقات کا ہوا ہے۔ جوان سلیم الطبع اور سخن فہم نظر پڑا آزاد وضع اور وارستہ مزاج دکھائی دیا۔ یہ اشعار اس کے خلاصۂ افکار ہیں:

نالۂ درد و الم میں نے جب آغاز کیا		جو ترے غم کے سوا تھا قلم انداز کیا
اتنا بھی داغِ عشق سے معمور ہو گیا	ولہ	سینہ تمام خانۂ زنبور ہو گیا
یار تیری ہی زلف میں دیکھا	ولہ	ایک زنجیر لاکھ دیوانہ
کیا خیال آوے بلاؤں سے اُسے پرہیز کا	ولہ	ہے جو بیمار اس تری چشمِ بلا انگیز کا
آگ ہر ساعت برستی ہے نہ تنہا چشم سے		ہے تماشا استخوانوں میں مری گلریز کا
جب غمزۂ چشمِ یار دیکھا	ولہ	سو تیر جگر کے پار دیکھا
یاد آگئی مُشتِ خاک اپنی		اُڑتے جو کہیں غبار دیکھا
دل خس و خاشاک کی صورت اٹکتا ہی رہا	ولہ	گو سدا دامن کو اپنے وہ جھٹکتا ہی رہا
جستجو میں یار کی گم کردہ راہوں کی طرح		میں کبھی ادھر کبھی اودھر بھٹکتا ہی رہا
خط ترا نامِ خدا خط ہے ادا و ناز کا	ولہ	دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے اس آغاز کا
کیا اس کو جتا دیں ہم جو ہم نے کیا ہوگا	ولہ	کیا کیا نہ کیا ہوگا جب دل کو دیا ہوگا
دل میں برنگِ موج تمہارے وصال کا	ولہ	بڑھ بڑھ کے اشتیاق کئی بار گھٹ گیا
ہر دم مجھے نیاز اُسے ناز ہی رہا	ولہ	انجامِ کارِ عشق کا آغاز ہی رہا

صیاد فائدہ ہے رہائی سے کیا مجھے		اُڑنے سے جب مرا پرِ پرواز ہی رہا
سدا انکلاہی کرتا ہے پگھل کر آتشِ غم سے	وله	سرشک آنکھوں سے میری روغنِ بادام کی صورت
خدا ہرگز نہ دکھلاوے کسی کو غیر بسمل کے		تمہارے خنجرِ مژگانِ خون آشام کی صورت
تیرِ نگاہ بسکہ لگی چھوٹ چھوٹ کر	وله	چھاتی مشبکہ وار ہوئی پھوٹ پھوٹ کر
یہ داغِ عشق مثل سِنے نے نواز کے		نکلے ہے بند بند سے اب پھُوٹ پھُوٹ کر
پہلو میں رکھوں میں دلِ ناشاد کہاں تک	وله	اے درد کروں نالہ و فریاد کہاں تک
در آج قفس کا ہے کھلا کیجئے پرواز		اے ہم قفساں خاطرِ صیاد کہاں تک
زمانے سے نرالے ہیں جگر افگار رکھتا ہوں	وله	کہ لوگ ابرو جسے کہتے ہیں میں تروار رکھتا ہوں
جز یادِ حق نہ ہو ترے دل میں کبھو گرہ	وله	دے سبحہ وار منہ پہ اگر اپنے تو گرہ
ہر دم نمود قبضہ شمشیر کی طرح		رہتی ہے ابروؤں میں ترے تند خو گرہ
دل کی طلب ہے اور تمنا ہے جان کی	وله	کیا مہربانیاں ہیں مرے مہربان کی
درد و الم سے منزلت دل ہے بس بلند		یعنی مکیں سے ہے گی بزرگی مکان کی
لے خانہ اس غلام ارشاد کیجئے	وله	گو کام کا نہ ہووے تو آزاد کیجئے
کوئے بتاں تلک تو رسائی محال ہے		جب تک یہ مشتِ خاک نہ برباد کیجئے
پیارے یہ وضع چشم مروت سے دور ہے	وله	دل لے کے اس طرح بھی نہ آنکھیں چرائیے
رو برو تیرے ہی گر ظالم نہ یہ دل کیجئے	وله	پھر اس آئینہ کو جا کس کے مقابل کیجئے
اُٹھتا ہے وہ غبار ہمارے مزار سے	وله	ٹکر لیا کرے ہے جو نت کوہسار سے
آوارگی سے باز رکھوں آہ کس طرح		دل تو گزر چکا ہے مرے اختیار سے
گریہ افزا اس قدر اعضا مرے سارے ہوئے	وله	ہر بنِ مو جوش سے آنسو کے فوارے ہوئے
پیش آئی ہمارے وہ جو کچھ کہ تھی پیش آنی	وله	اب یہ در دولت ہے اور اپنی یہ پیشانی
عشق کی بازی میں بسمل دل جنے در کار ہے	وله	کس لئے تو اس قدر بیٹھا ہی جی ہار ہوئے

تیری ہی یاد ذکر ہی تیرا ہر آن ہے	ولہ	گویا کہ اس لئے مرے مُنہ میں زبان ہے
عہد و پیمان بتاں بسکہ بہ سالوسی ہے	ولہ	ایک اُمید تو سو باعثِ مایوسی ہے
داغ اتنے ہی دیئے عشق نے تیرے کہ تمام		مو بہ مو تن پہ مرے جلوۂ طاؤسی ہے
آیئے جلد کہ یہ بسمل مجروح ہنوز		ہر لبِ زخم سے مشتاقِ قدم بوسی ہے
دُکھ درد کو کب تلک حکایت کیجے	رباعی	دوراں کی کہاں تلک شکایت کیجے
اس کشور دل پہ فوج غم کا ہے ہجوم		یا شاہِ نجف میری حمایت کیجے

بابُ التّاء

۱۔ تاناشاہ

نام نامی اور اسمِ گرامی اس بادشاہ عشرت دوست کا ابوالحسن تاناشاہ ہے۔ سلاطینِ نامدار اور خواقین عالی مقدار دکھن سے تھا۔ اگرچہ شہرۂ عیش و نشاط کا اور آوازہ مسرت و انبساط کا اس عیش مجسم کے ماہ سے ماہی تک مشہور ہے، لیکن کچھ تھوڑا سا احوال اس سریر آرائے بارگاہ عیش و کامرانی کا یہاں لکھنا ضرور ہے۔ جس ایام میں کہ عالمگیر خلد مکان نے عادل شاہی اور نظام شاہیوں کو زیر و زبر کیا، اور صوبہ دکھن کو بعد بہت سی خرابی کے لیا، تو ابوالحسن تاناشاہ بھی نظربندی میں آئے، اور فلکِ نیرنگ باز نے بدلے اس عیش و عشرت کے اور ہی رنگ دکھا سامانِ عیش سب برہم ہوا، اور مجمعِ اربابِ نشاط حلقۂ ماتم ہوا۔ خلد مکان نے جس قدر تنگی ان کے اوقات میں چاہی، انہوں نے قبول کیا، لیکن حُقّہ کے مقدمہ میں بہت سماجت کے ساتھ اتنی بات کہلا بھیجی کہ اس کا شوق مجھے بہ نہایت ہے، جو رعایت کہ اس کے سامان میں ہوگی وہ عین عنایت ہے۔" ازبسکہ یہ بادشاہ عشرت دوست آٹھ پہر نشۂ عیش میں مخمور رہتا تھا، حُقّہ ایک دم مُنہ سے نہیں چھٹتا تھا، اور یہ بھی معمول تھا کہ بعد ہر چلم کے ایک شیشہ سے گلاب کے حُقّہ تازہ

ہو وے، پھر ایک شیشہ میں بید مشک کے حقّہ بردار نیچے کو بھگو وے، شغل میں عیش و نشاط کے از بسکہ دن کو کم سوتے تھے، سیکڑوں شیشہ گلاب خالص اور عرق بید مشک کے دن رات میں خرچ ہوتے تھے۔ یہ سب احوال مفصّل خلد مکان کو معلوم تھا۔ علاوہ اس کے بادشاہ نے ابن عجز سے کہلا بھیجا۔ بارہ سولہ شیشہ گلاب کے اور آٹھ شیشہ بید مشک کے حکم فرمائے۔ سبحان اللہ! یا تو حقّہ آٹھ پہر منہ سے نہیں چھٹتا تھا، اور اُن کے دودِ محفل کے رشک سے دھواں حسد کا حُقّہ سپہر آسمان میں گھٹتا تھا، یا پیچ سے فلک حقہ باز کی آٹھ چلمیں دن رات میں یہ پیتے تھے، اور گھونٹ گھونٹ کر عجب پیچ و تاب کے ساتھ جیتے تھے۔ اس میں بعد کئی دن کے حضرت خلد مکان نے فرمایا کہ سولہ شیشہ گلاب اور بید مشک کے ہر روز حُقّہ کے مصرف میں آنے اسراف ہے، اور امورات شرعی میں پاسِ خاطر بیجا بیجا، اور تکلّفِ رسمی معاف ہے۔ آٹھ شیشہ ہر روز یہاں سے جایا کریں ایک شیشے سے بعد ہر چلم کے حقہ تازہ کرکے آٹھ چلمیں دن رات میں پئیں۔ جب حضور سے ہر روز آٹھ شیشہ آنے لگے، تو یہ دن رات میں لاچار چار چلموں سے دل بہلانے لگے۔ یہ ماجرا سُن کر خلد مکان نے ضد کے مارے چار شیشوں کی اور تخفیف کی۔ انہوں نے اپنے حُقّہ بردار کو دو چلموں کی پروانگی دی۔ بعد کئی دن کے جب دو شیشے اور کم ہوئے، تو ایک چلم دن رات میں یہ پیا کرتے تھے جس دن ان دونوں شیشوں کا بھی آنا موقوف ہوا، اُس دن انہوں نے عرض کیا۔ جہاں پناہ کی دولت سے اتنا کچھ بعد خرچ کے جمع کیا ہے کہ دس چلمیں روز اسی خرچ کے ساتھ سالہا سال پلا سکتا ہے، اُمید ہے کہ بھیڑی خانے کے خرچ کا غلام کو حکم ہو وے کہ نمک حلال کا زمین میں سرخروئی کے بو وے۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت اعلیٰ کو امورات شرعی کا بہ شدت دھیان ہے، اگرچہ مسجد کا کھود ڈالنا، خزانہ اُس کے نیچے گڑا سُن کر، نہایت آسان ہے، تو جو ہمارے مصرف بیجا کا کفیل ہوتا ہے ابھی ایک دم میں جمع پونجی سر پہ ہاتھ دھر کے روتا ہے۔ غرض اُس دن سے پھر حقہ نہ پیا، جب تک کہ ان کی نظر بندی میں رہے، اور اس سرائے فانی سے عالم باقی کو تشریف لے گئے سبحان اللہ! چشم حقیقت بین سے اگر کوئی دیکھے تو دنیا جائے حسرت ہے، بلکہ خانۂ زحمت ۔

کدھر ہیں خسرو و جم لطف کیقباد کدھر   کہاں سکندر و دارا کہاں ہے کیکاؤس
جو مست جاہ ہیں دیکھیں وہ چشمِ عبرت سے   کچھ ان کے ساتھ گیا غیر حسرت و افسوس

اگرچہ ملک گیری اور کشورستانی کے معاملہ کو سمجھنا شاہانِ عالی تبار پر ختم ہوا ہے، گدائے گوشہ نشین کو دخل ان امورات میں کیا ہے، لیکن بعضے دانشمند کہتے ہیں کہ خلد مکان نے استیصال بادشاہانِ دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد[1] کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے تحصیل حاصل سے بھی اس میں کچھ کیفیت زیادہ ہے کس واسطے کہ پیش از تسخیر دکن کے بھی خراج و باج اس طرف سے چلا آتا تھا، اور بادشاہان ہندوستان کا شہنشاہ کہاتا تھا۔ مآل اس مشقت کا عجوبہ نظر آیا، کہ اس حسن تردد نے شاہنشاہ کو بادشاہ کر دکھایا +

واقف رموز ملک سے ہیں شاہ و شہریار   ہے تو گدائے گوشہ نشیں لطف کچھ نہ بول[2]

غرض شاہ عالیجاہ ابو الحسن تاناشاہ کی طرف لوگ اس مطلع کو منسوب کرتے ہیں، اور باعتبار محاورۂ دکن کے، اور بندش قدیم کے، کہ اس مطلع میں ہے، ابراہیم خاں مرحوم بھی گفتگو پر لوگوں کی گوش دل کو دھرتے ہیں مطلع یہ ہے +

کس سوں کہوں، جاؤں کہاں، مجھ دل پہ بھبل بھبرات ہے   اک بات کے ہونگے سجن، یہاں جی ہی بارہ بات ہے

۲-تاباں

تاباں تخلص، میر عبد الحی نام، شاہ جہان آبادی۔ نہایت عزیز خوبصورت اور صاحب جمال تھا، ایسا کہ دلّی سے شہر میں بے مثال تھا۔ ہندو مسلمان ہر گلی کوچہ میں ایک نگاہ پر اس کی لاکھ جان سے دین و دل نذر کرتے تھے، اور پرے کے پرے عاشقانِ جانباز کے یاد میں اس لبِ جان بخش

[1] مکہ مسجد حیدرآباد میں اب تک موجود ہے۔ اس کا کھدوانا خلاف واقعہ ہے ۱۲

[2] مصنف نے حافظ کے اس شعر کا ترجمہ کیا ہے ؎

رموز مملکت خویش خسرواں دانند   گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

مسیحا دم کے مرتے تھے۔ تکلف یہ ہے کہ اس رعنائی اور دل ربائی پر خود بدولت بھی دل کو کھو بیٹھے تھے، اور ہنستے ہنستے بے اختیار صبر اور اختیار کو رو بیٹھے تھے۔ اس بے دردی اور شیریں ادائی پر مانند فرہاد کے چاشنیِ دردسے آگاہ، اس سوہنی اور لیلی صفتی پر مانند مجنون کے ہمیشہ سرگرم نالہ و آہ تھے، یعنی ایک سلیمان نام لڑکے کو چاہتے تھے، اور اُس کے دردِ محبت سے، باوجود وصل کے، آٹھ پہر کراہتے تھے۔ وہی سلیمان، کہ بالفعل شاہ سلیمان کرکے معروف تھا، اور ادا کرنے میں راہ ورسم درویشی کے بہ شدت مصروف، اس مورِ ضعیف نے عالم پیری اُس کا سن ۱۲ بارہ سو ایک ہجری تھے، کہ بلدۂ لکھنؤ میں دیکھا۔ اگرچہ ریش سفید اور قد خمیدہ رکھتا تھا، لیکن اُسکے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کسی وقت میں بڑے بڑے گردن کش، سوئی کے ناکے سے نکالے ہوں گے +

غرض میر عبدالحی تاباں تخلص میرزا جان جاناں مظہر سے اور میرزا رفیع سودا سے ہمیشہ صحبت رکھتے تھے، بلکہ میرزا رفیع سودا بنا بر اک نظر توجہ کے، کہ اُن کے حال پر تھی، اکثر اشعار کو ان کے اصلاح کرتے تھے۔ عین شباب کے عالم اور جوبن کے عروج میں، کہ زمان فرمان فرمائے محمد شاہ فردوس آرام گاہ کا تھا، اس ماہِ تابانِ حُسن نے جامۂ زندگی کو مانند کتان کے چاک کیا ہے یہ منتخب ان کے دیوان کا ہے +

سرسبز خط سے دونا ہوا حسن یار کا		آخر خزاں نے کچھ نہ اُکھاڑ ابھار کا	
اکثر جو اس زمین کو ہوتا ہے زلزلہ		شاید گڑا ہے جسم کسی بے قرار کا	
کس کس طرح سے دل میں گذرتی ہیں حسرتیں		ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا	
اخگر کو چھپا رکھیں، میں دیکھ کے سمجھا	ولہ	تاباں تو تہِ خاک بھی جلتا ہی رہیگا	
کوئی دوسرا مجھ سا تاباں نہ ہوگا	ولہ	کہ دل دے تجھے پھر پشیماں نہ ہوگا	
جفا سے اپنی پشیمان نہ ہو، ہوا سو ہوا	ولہ	تری بلا سے مامرے جی پہ جو ہوا سو ہوا	
نہ پائی خاک بھی تاباں کی ہم نے پھر ظالم		وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا	

بیتاب ہوں کی عشق کے کرتا ہے کیا علاج	ولہ	تاباں یہی جو دل ہے تو آرام ہو چکا
آشنا ہو چکا ہوں میں سب کا	ولہ	جس کو دیکھا سو اپنے مطلب کا
ہیں بہت جامہ زیب پر ہم نے		کوئی دیکھا نہیں یہ چپ ڈھب کا
یاں پلک بھی نہ ہم سکیں جھپکا		ایسا قاصد تو جا بیٹو لپکا
دیا ہے جی میں اپنا دیکھ کر سج جیسکے جامہ کی	ولہ	اُسی کا لے کے دامن کیجیو یارو کفن میرا
لیا تھا دوستی سے جن نے دل ہائے	ولہ	وہ اب دشمن ہوا ہے میرے جی کا
مجھے ترسا کے اس کافر نے مارا		نتیجہ کیا یہی تھا عاشقی کا
ہونٹوں پہ تیرے ظالم مسی کی یہ دھڑی ہے	ولہ	یا اُن کے تئیں کسی نے ٹل ٹل کیا ہے نیلا
اکیلا صنم باغ میں کل گیا تھا	ولہ	اسے دیکھ کانٹوں پہ گُل لوٹتا تھا
لیا چاہ سے کھینچ یوسف کو اپنے	ولہ	ترا عشق تاباں قیامت رسا تھا
فغاں نے مرا مُنہ پھر آکر کھلایا[1]		ابھی روتے روتے ہی چپکا رہا تھا
مری لوح تربت پہ یارو کھُدانا	ولہ	نہ اس سنگ دل سے کوئی جی لگانا
ترے غم سے نِسیاں ہے یاں تک تو مجھکو		اِدھر بات کہنا اُدھر بھُول جانا
گلی میں اپنی روتا دیکھ مجھ کو وہ لگا کہنے	ولہ	کہ کچھ حاصل نہیں ہونیکا ساری عمر رو بیٹھا
صبا میرا پیغام اُن تک تو لے جا	ولہ	کہ تجھ بن رہیں ہم، کہاں یہ کلیجا!
کسی بات کا میں نہ شکوہ کروں گا		ترے جی میں آوے سو مجھ کو کہے جا
ایسے کے تئیں کوئی سر پہ بھی چڑھاتا ہے؟	ولہ	کھینچے ہے تری زلفیں، کیا شوخ ہے یہ شانہ
تمہارے ہجر میں رہتا ہے غم ہم کو میاں صاحب	ولہ	خدا جانے جئیں گے یا مرینگے ہم میاں صاحب
مرا بس ہو تو ہرگز خط نہ آنے دوں ترے لیکن	ولہ	لکھا قسمت کا کوئی بھی مٹا سکتا ہے کیا قدرت

[1] یعنی کھلوایا ۱۲

غیر کے ہاتھ میں اُس شوخ کا دامان ہے آج	وله	میں ہوں اور ہاتھ ہی اور میرا گریبان ہے آج
لے میری خبر چشم مرے یار کی کیوں کر	وله	بیمار عیادت کرے بیمار کی کیوں کر
کہتے ہیں اثر ہیگا گریہ میں ہیں یہ باتیں	وله	اک دن بھی نہ یار آیا روتے ہی کٹیں راتیں
سن فصل گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں	وله	کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں
بیمار ہے زمیں سے اُٹھتی نہیں عصا ہن		نرگس کو تم نے شاید آنکھیں دکھائیاں ہیں
قسمت میں کیا ہے دیکھیں جیتے رہیں کہ مرجائیں		قاتل سے اب تو ہم نے آنکھیں لڑائیاں ہیں
آشنا تو مجھ سے ایسا ہے کہ جیسا چاہیئے	وله	پر جو کچھ دل چاہتا ہے ہائے وہ ہوتا نہیں
شب کو پھرے وہ رشک ماہ خانہ بخانہ کوبکو	وله	دن کو پھروں میں وادخواہ خانہ بخانہ کوبکو
گئے نالہ ترے برباد جوں بانگ جرس چپ رہ	وله	اثر دیکھا تری فریاد میں دل ہم نے بس چپ رہ
سلیماں کیا ہوا گر تو نظر آتا نہیں مجھ کو	وله	مری آنکھوں کی پتلی میں تری تصویر پھرتی ہے
بتاں کے شہر ناپرساں میں کب کوئی داد کو پہنچے	وله	مگر یہاں اپنے بندوں کی خدا فریاد کو پہنچے
تو بھلی بات سے بھی میری خفا ہوتا ہے	وله	کیا بھلا چاہنا ایسا ہی بُرا ہوتا ہے
تیری ابرو سے مرا دل نہ چھٹے گا ہرگز		گوشت ناخن سے کہوں کوئی جُدا ہوتا ہے

ترے پاس عاشق کی عزت کہاں ہے	وله	تجھے بے مروت مروّت کہاں ہے
میں شکوہ کروں جور ظالم سے لیکن		مجھے آہ و نالہ سے فرصت کہاں ہے
بیاں کیا کروں ناتوانی میں اپنی		مجھے بات کہنے کی طاقت کہاں ہے
جو اُس کی کمر میں نے دیکھی ہے تاباں		رگِ گل میں ایسی نزاکت کہاں ہے
جو کرتا ہوں فریاد میں اُس کے آگے	وله	تو کہتا ہے تاباں تو جانا نہیں ہے
ابھی پست ہو جاگا[۱] لاتوں کے مارے		ترا شور کچھ مجھ کو بھاتا نہیں ہے

[۱] ہو جاگا یعنی ہو جائے گا۔

رباعی

ہوتا ہوں ترا جو اشتیاقی ساقی — بیخود ہو پکارتا ہوں ساقی ساقی
ہے مجھ کو خمار شب کالا، صبح ہوئی — شیشے میں جو کچھ کہ مے ہو باقی ساقی

مخمس

بیاں میں کیا کروں دیوانگی کا اپنی افسانہ — نہ میرا گھر میں جی لگتا نہیں بھاتا ہی ویرانہ
خوش آتا ہی مجھے گلیوں میں سنگِ کودکاں کھانا — ارے ناصح عبث ہی یہ ترا بیہودہ سمجھانا
پریرو ہو جدا جس کا سو ہو کیونکر نہ دیوانہ

عبث مت بک نہیں میں مانتا کہنا ترا ناصح — مری آہ و فغاں کرنے سے بتلا تجھ کو کیا ناصح
میں اپنے جی ہی سے بیزار ہوں مت توُ ستا ناصح — بھلا چاہے تو اپنی آبرو کو لے کے جا ناصح
مجھے بیطرح آتا ہی تری باتوں پہ جھجلانا

تو کیوں بیہودہ بکتا ہے نصیحت کے سخن اکثر — سنوں کیونکر تری باتیں کہ میرا حال ہی ابتر
رہوں آرام سے بے یار اے ناصح بھلا کیونکر — کہ میری زندگی اور موت ہی موقوف اس جا پر
اگر آوے تو جی جانا اگر جاوے تو مر جانا

کبھی راتوں کے تئیں کرتا ہوں گھر میں نالہ و افغاں — کبھی پھرتا ہوں صحرا بیچ میں وحشت سے ہو عریاں
کبھو ہوتا ہی تاباں ساتھ میرے محشرِ طفلاں — مرے تئیں اس طرح سے دیکھ کر سب خوار و سرگرداں
کوئی کہتا ہی سودائی کوئی کہتا ہی دیوانا

باب الجیم

۱۔ جہاندار

جہاندار تخلص، میرزا جواں بخت جہاندار شاہ نام، خورشید آسمانِ بلند اختری اور سرفرازی کا ولی عہد شاہ عالم بادشاہ غازی کا، رونق دینے والا بارگاہ جہانداری اور جہانبانی کو، زینت بخشنے والا مسندِ ملک گیری اور کشورستانی کو، ہر خط جبینِ جہاں افروز کا اُس کے واسطے روشن کرنے عالم کے، مانند خطوط شعاعی آفتاب کے، دور کرنے والا تاریکی خلائق کا تھا، اور دوست دریا نوال اُسکا

افراط جود و کرم سے مانند ید بیضا کے روشن کرنے والا خوش ناموسی امارت اور ایالت کا بخشش نے اُس کی، دشمنی آسمان کے دل سے فلک زدوں کی نکالی، اور ہمت نے اُس کی گرہ بدطالعی کی پیشانی سے بدبختوں کی کھول ڈالی جس ایام میں کہ ناموافقت سے اُمراء دولت کی۔ نشانِ کیوان شان اس فلک جناب کے دار الخلافہ دلّی سے بیچ حرکت کے آئے، تو ۱۱۹۸ھ گیارہ سو اٹھانوے ہجری تھے، کہ خود بدولت و اقبال لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب آداب و خدمت گذاری کے تھے، سب ادا کیئے، خواصی میں بیٹھنے کے سوائے گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے۔ باوصف اس ناز پروری کے کہ کبھی پیادہ چار قدم کا ہے کو چلے تھے۔ پانچوں ہتیار باندھے ہوئے ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ حجرہ گاہ پرسے جاکر آداب بجا لاتے تھے۔ غرض اس شہزادۂ عالی تبار کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر آئی تھی، کہ مہینے میں دو مرتبہ بنا مشاعرے کی اپنے دولت خانہ میں ٹھہرائی تھی۔ شعراے باوقار کو اپنے چوبدار بھیج کر مشاعرے کے دن بلواتے، اور ہر ایک شخص سے نہایت الطاف اور عنایت کے ساتھ گرم جوشی فرماتے۔ چنانچہ راقم حقیر کو جب یاد فرمایا، تو اس ہیچمدان نے یہ عذر کہ بھوایا کہ "کمترین نے مشاعرے کا جانا مدت سے موقوف کیا ہے، ازبسکہ ان صحبتوں میں مناظرہ ہی کو یاران عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے، اگر ارشاد ہو تو سوائے مشاعرے کے ایک دن بندگی میں حاضر ہوں، اور اس تخم نا کاشتنی بمیغز کو موافق ارشاد کے زمین عرض میں بوؤں۔" پذیرا نہ ہوا، پھر چوبدار آیا، اور یہ ارشاد فرمایا کہ "تیرا حاضر ہونا مشاعرے میں نہایت ضرور ہے، مناظرے کا مطلق ہمارے ہاں نہیں دستور ہے۔" غرض ایماسے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا، اور شرف سعادتِ ملازمت کا حاصل کیا۔ مگر غزلیں اُس دن ازراہ تفضلات کے پڑھوائیں، اور ہر شعر پر کیا کہوں کہ کیا کیا عنائتیں فرمائیں۔ پھر اپنی طبع زاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا، اور سامعین کو موردِ عنایت و امداد فرمایا۔ سنہ ۱۲۰۱ھ بارہ سو ایک ہجری میں بلدۂ بنارس کے اندر اس سریر آرائے بارگاہ شوکت و اجلال نے تخت نشینی ملک فنا کی چھوڑکر اورنگ آرائی کشور بقا کی اختیار کی۔ یہ اشعار منتخب اُس سلطان عالی تبار کے ہیں:

نہ پوچھو دہر میں کیا کر چلے ہم | اسی ہی آرزو میں مر چلے ہم
رہے اک شب جو اس ماتم کدے میں | بسانِ شمع رو رو کر چلے ہم
اکیلے تھے ہم اب اک فوج غم ہی | ترے در سے مع لشکر چلے ہم
نہ تھے جوں گل کبھی اوراقِ دل جمع | کہ اس گلشن میں کر ابتر چلے ہم
رہے در پر بتاں کے تم جہاندار | خدا حافظ تمہارا گھر چلے ہم

ولہ

جدا ہو تجھ سے صنم سخت بیقرار ہوں میں | یہ دیکھ آئینہ ساں چشم انتظار ہوں میں
بسا ہے میرا سراپا جو عطرِ فتنہ سے | یہ کس کی نرگسِ فتّاں سے دوچار ہوں میں
نہ جور سے فلکِ حیلہ گر سے گھبرا کر | مثال ابر بہاری کے اشکبار ہوں میں
نظر پڑا ہے وہ آویزۂ گہر جب سے | صدف سے چشم کی تب سے گہر نثار ہوں میں
ہے آفتاب کا سر پہ مرے جو پرتوِ مہر | بسانِ ماہ جہاندار آشکار ہوں میں

ولہ

ہیں بسکہ جزوِ تن مرے طاؤس وار داغ | رکھتا ہے ایک ایک عجب ہی بہار داغ
رعنائی تیری دیکھ کے ای سروِ باغِ حُسن | جوں لالہ دل پہ کھاتے ہیں سب گلعذار داغ
آتش پہ ہے یکسر دل کی جہاندار جوں سپند | چاہوں جو ٹھہرے، کر نہیں سکتا قرار داغ

۲-جرأت

جرأت تخلص، یحییٰ امان قلندر بخش نام، بیٹا حافظ امان کا۔ شاعرِ شیریں کلام ہے۔ ظاہر الفظ "امان" کا ان کے بزرگوں کے نام پر بطور خطاب کے زمان اکبری سے چلا آتا ہے، اور جرأت مذکور رشید شاگردوں میں میرزا جعفر علی حسرت تخلص کے گنا جاتا ہے۔ علم موسیقی میں مشغلہ بھلا چنگا رکھتا ہے، اور ستار کے بجانے میں نہایت دست رسا رکھتا ہے۔ نجوم میں بھی اس شخص کو دخل تمام ہے، ایسا کہ ایک عالم لکھنؤ کا اس کا منتظرِ احکام ہے۔ تمام عمر عزیز کی بیکاری میں بسر ہوئی ہے، اور بے روزگاری میں کٹی ہے۔ ابتدا میں نواب محبت خاں محبت تخلص اعانت اخراجات ضروری

کی کرتے تھے، بالفعل، کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، صاحب عالم و عالمیان میرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے کچھ امداد ہوتی ہے۔ اگرچہ بصارت چشم سے یہ عزیز معذور ہے، پر ملاقاتوں کو دوستوں کی پھرتا دور و دور ہے گو کہ آنکھوں سے کچھ نہیں سوجھتا ہے، لیکن مضمون رنگیں سوجھتا ہے، زبان ریختہ میں صاحب دیوان عظیم الشان۔ یہ اُس کا منتخب دیوان سے +

چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا	ولہ	دن گیا رات ہوئی، رات گئی دن آیا
دن بدن تحلیل تو جرأت ہوا جاتا ہے کیوں؟	ولہ	آہ! یہ بیٹھے بٹھائے تجھ کو کس کا غم لگا
دل کو اے عشق سوئے زلف سیہ فام نہ بھیج	ولہ	رہزنوں میں تو مسافر کو سر شام نہ بھیج
روشن ہے اس طرح دل ویراں کا داغ، ایک	ولہ	اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک
میرے ہونے سے تو کچھ گرمئ بازار نہیں	ولہ	ہوں میں وہ شے کہ کوئی جس کا خریدار نہیں
دل تو اُمڈے ہے پہ حیرت سے میں کیونکر رودوں		ابر تصویر کو گریہ سے سروکار نہیں
درد کیا جانئے کیا کیا یہ بیاں کرتا یار		دہن زخم کو گویا لب گفتار نہیں
تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی،		جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں
جس کے غم میں آہ ہم آرام سے واقف نہیں	ولہ	کیا غضب ہے، وہ ہمارے نام سے واقف نہیں
رو کے میں پوچھا کہ مقصد جانتے ہو تم مرا		ہنس کے بولا میں کسی کے کام سے واقف نہیں
کیا قتل دو عالم تو نے جنبش سے اک ابرو کی	ولہ	اگر یہ جھوٹ ہو تو تیغ پر ہم ہاتھ دھرتے ہیں (یعنی قسم کھاتے ہیں ۱۲)
برنگ طائر تصویر ہیں ہم باغ حیرت میں		کب اپنے آشیاں سے صحن گلشن میں اُترتے ہیں
نالہ و آہ و فغاں بھی مرا دم بھرتے ہیں	ولہ	آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں
اے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں	ولہ	تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں
کچھ تو نکلے آرزو دشنام دے تلوار کھینچ		چشم حسرت سے کہاں تک دم بہ دم دیکھا کریں
کہتے ہیں آپس میں ہمسایہ مری فریاد سے		مصلحت یہ ہے کہ اس کے پاس سے گھر چھوڑ دو
کیا کیا میں نے گناہ جو اپنے لوگوں سے یہ تم		کہتے ہو جا کر اُسے بستی کے باہر چھوڑ دو

ولہ
آنے کی خبر ہے اُس کے لیکن
آتا نہیں اعتبار دل کو

ولہ
اُسکے آنے میں اب جو دیر ہے کچھ
یہ بھی قسمت کا ہیر پھیر ہے گویا

جب نہ تب خوں مرا ہی پیتا ہے
غم بہت اس کا مجھ پہ شیر ہے کچھ

تھا یہ جرأت ہی اُس کی کوچہ میں
وہ جو اک خاک کا سا ڈھیر ہے کچھ

ولہ
جاتے ہیں اُس کی در سے یہ جانا محال ہے
جس جا قدم پڑے ہے اُٹھانا محال ہے

رونے میں اور آتشِ اُلفت بھڑک اُٹھی
اب اس لگی کا دل سے بجھانا محال ہے

کیا قہر ہے کہ بزم میں اُس شوخ کی مجھے
سب کہتے ہیں کہ تجھ کو بٹھانا محال ہے

جا بیٹھتے تھے در پہ جو اُس کے وہ دن گئے
اُدھر کو اب تو آنکھ اُٹھانا محال ہے

ولہ
کس کی سنوں بات میں اے مہرباں
دھیان تو رہتا ہے تمہارا مجھے ؎

ولہ
غم بہت دنیا میں ہے پر عشق کا غم اور ہے
ہے اسی عالم میں لیکن اُس کا عالم اور ہے

ولہ
گر کسی ڈھب سے کوئی مجھ کو ہنسا دیتا ہے
غمِ فرقت وہیں کچھ یاد دلا دیتا ہے

شب کو ٹک خواب جب آتا ہی تو ٹک اُسکا خیال
آنکھ لگنے نہیں پاتی کہ جگا دیتا ہے ؎

لختِ دل کی مرے یہ اشک رواں ہیں ہے بہا
برگِ گُل جوں کوئی دریا میں بہا دیتا ہے

گھر سے وہ جاوے جہاں میں بھی وہیں موجود
نہیں معلوم مجھے کون بتا دیتا ہے

ولہ
سخت تجھ بن قلق اس دل کا ستاتا ہے مجھے
گہ بٹھاتا ہے یہ اور گاہ اُٹھاتا ہے مجھے

ولہ
دل بھڑکے ہے ٹک مصحفِ رُوجان دکھادے
سرگرم ہے آتش اسے قرآن[1] دکھادے

ولہ
رہنے کی جا جہاں میں ہم خوب پا گئے
جوں درد اہلِ درد کے دل میں سما گئے

ہم گلشن جہاں میں جوں آتشیں انار
اک دم کی زندگی کا تماشا دکھا گئے

ولہ
جوشِ گل چاک قفس سے دمبدم دیکھا کئے
سب بنے یاں لوٹیں بہاریں اور ہم دیکھا کئے

ولہ
شب بزمِ یار میں ہم بیٹھے تو تھے پر اُس کی
چتون سے تھا یہ ظاہر یہ شخص یہاں سے نکلے

[1] جب گھر میں آگ لگتی ہے تو قرآن دکھاتے ہیں کہ اس کی برکت سے بجھ جائے ۱۲

عزیز وصل میں بھی ہم جو رو رو کر نہ سوتے تھے	وله	سو اندیشہ تھا روز ہجر کا اُس دن کو روتے تھے
کچھ ہم تو نہ سمجھے کہ شب وصل کدھر تھی	وله	ٹک زلف سے جو رُخ پہ نظر کی تو سحر تھی
ترے بن بستر اندوہ پر کچھ یاد میں کر کے	وله	پڑا روتا ہوں پہروں یار منہ پر آستیں دھر کے

۳۔ جوشش

جوشش تخلص، شیخ محمد روشن نام، وطن ان کا عظیم آباد ہے، خوش لیاقتی ان کی جو کچھ کہئے اُس سے زیادہ ہے۔ طبیعت ان کی نظمِ ریختہ میں نہایت رسا ہے، اور معنی بیگانہ سے بہ شدت آشنا ہے۔ چاشنی درد کی کلام سے ان کے ظاہر، اور علم عروض سے یہ بخوبی ماہر ہیں۔ شیوہ اختیار انھوں نے میر درد کا کیا ہے، اور اس طور کو بہت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ "جس ایام میں یہ تذکرہ لکھتا ہوں، تو شیخ مذکور نے اشعار اپنے مجھ کو بنارس بھجوائے، تاکہ نام اُس کا اس تذکرہ میں لکھا جائے۔ نہایت پسند آیا مجھ کو اسلوب ان کے بیان کا، چنانچہ اس طرح لکھا گیا انتخاب ان کے دیوان کا +

کس طرح سے اوصاف ہو خلاق جہاں کا		قدرت نہ قلم کی ہے نہ مقدور زباں کا
عاشق کو ہے کب جلوۂ معشوق کی طاقت		مہتاب کو دیکھے نہیں مقدور کتاں کا
اس گلشنِ ہستی سے نکل راہ عدم لے		نیرنگ نظر آوے ہے کچھ رنگ یہاں کا
عنقا کی طرح گو کہ نشاں وہ نہیں رکھتا		ملتا ہے پتا نام ہی سے اسکے نشاں کا
اس دل کو دکھاتا ہوں میں بازار محبت		خطرہ نہیں جوشش مجھے کچھ سود و زیاں کا
ہم چشم کیوں کہوں میں اسے شعلہ زار کا	وله	عالم ہے کچھ جدا ہی دل داغدار کا
سرکار بے خودی کا یہ مختار کار ہے		کیا اختیار ہے دل بے اختیار کا
پیتا ہے گر تو بادۂ عشرت سمجھ کے		جوشش بڑا ہے درد سر اسکے خمار کا
بزم میں یک شب بھی نہ پایا نہ دل گلگیر کا	وله	فائدہ اے شمع اشک و آہ بے تاثیر کا

دمبدم آلودہ رہنا خون سے عشاق کے
جوہر ذاتی ہے یہ جوہر تری شمشیر کا

وله
دیکھ کر رنگ صنم تیری جفاکاری کا
کوہکن ہو تو نہ دم مارے وفاداری کا

چشم پُرآب ہے لب خشک و داغ آشفتہ
زورِ عالم ہے غرض دل کی گرفتاری کا

مُسکراتا ہے مجھے دیکھ رقیبوں کے حضور
یاد ہے اس کو عجب طور دل آزاری کا

وله
جی سیر میں گلزار کی، تن کنج قفس میں
یہ صید گرفتار ادھر کا نہ اُدھر کا

وله
گر کوئی کاٹ بھی لے سر تر کے دیوانے کا
پر یہ سودا تو کبھو سر سے نہیں جانے کا

کیوں نہ مضطر ہوں اُسے دیکھ کے دیکھو تو سہی
شمع کے سامنے کیا حال ہے پروانے کا

ہاتھ اُٹھاتا ہی نہیں یار جو سُلجھانے سے
دل تری زلف میں اُلجھا ہے مگر شانے کا

وله
سر اُس کی تیغ سے جبتک جُدا نہ ہووے گا
کسی طرح سے حق اس کا ادا نہ ہووے گا

کل اُن نے بیٹھ کے غیروں میں کی نگہ مجھپر
یہ تیر کس کے جگر میں لگا نہ ہووے گا

دل و جگر پہ ہی آفت نہیں فقط جوشش
جو ہے یہی ترا رونا تو کیا نہ ہووے گا

وله
غیروں پہ تو ستم کرے گا
ہم پر جو کبھی کرم کرے گا

ہم سا ہی وہ ہو گا سادگی میں
باور جو تری قسم کرے گا

جوشش مت رو دل و جگر کو
کس کا کس کا تو غم کرے گا

وله
دیکھ کر حُسن گلعذاروں کا
خانہ ویران ہوا ہزاروں کا

دیکھیں گر اس کی چشم پُرفن کو
ہوش اُڑ جائے ہوشیاروں کا

اُس کی آنکھوں کو دیکھیے اے جوشش
منہ تو دیکھو شراب خواروں کا

وله
ہو چشم حباب وار دیکھا
ہستی کو نہ پائدار دیکھا

جوں شیشۂ ساعت اس جہاں میں
وہ دل کو نہ بے غبار دیکھا

ہم مر ہی گئے پہ تو نہ آیا
بس ہم نے ترا قرار دیکھا

وله
اس ادا کا تری ہوں دیوانا
دیکھنا مجھ کو اور چھپ جانا

آج ہے جاں بلب ترا جوشش		جی میں آوے ترے تو آجانا
یاں مدعی اپنا کسے اے یار نہ دیکھا	وله	ہے کوئی جسے تیرا طلب گار نہ دیکھا
سوتوں کو جگایا مرے نالے نے عدم کے		پر طالع خوابیدہ کو بیدار نہ دیکھا
کل بزم میں سب پر نگہ لطف و کرم تھی		اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا
جز چشم بتاں میکدۂ دہر میں جوشش		ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا
کہتا ہے ایک عالم انصاف کر ہمارا	وله	سنتا نہیں کسی کی بیداد گر ہمارا
اوروں کی عیب جوئی اپنا ہنر نہیں ہے		اپنی ہی عیب جوئی ہے یہ ہنر ہمارا
سرگشتہ اس جہاں میں جوں گرد باد ہیں ہم		تھک کر جہاں کہ رہ گئے وہ ہی ہے گھر ہمارا
اپنا تو کچھ گناہ نہ آیا ظہور میں	وله	کیا بات ہو گئی کہ وہ بیزار ہو گیا
جہاں میں بادۂ عشرت پیا پیا نہ پیا	وله	سلوک بخت نے ہم سے کیا کیا نہ کیا
نگاہ لطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے		سلام اُن نے ہمارا لیا لیا نہ لیا
جب عشق میرا شہرۂ آفاق ہو گیا	وله	اک عالم اُسکے حسن کا مشتاق ہو گیا
کس سے ہوئی یہ دوستی ایسی کہ ان دنوں		آنا ہمارا دل پہ ترے شاق ہو گیا
ہوا ریگِ رواں کی طرح جس جاگہ گذرا اپنا	وله	بجز آواز کے کوئی نہ تھا واں ہم سفر اپنا
لگا دی دل میں آگ ہی آہ سوزاں کیا کیا تو نے		جلا دینا ہے اپنے ہاتھ سے بھی کوئی گھر اپنا
شب فرقت ہی بیتابی دل ہی درد پہلو میں		نظر آتا نہیں ہم کو تو بچنا تا سحر اپنا
تعلقات جہاں سے خبر نہیں رکھتا	وله	ہزار شکر کہ میں دردِ سر نہیں رکھتا
خفا ہوں جان سے دل کھول کر میں روتا ہوں		تری گلی میں کسی کا میں ڈر نہیں رکھتا
تجھ سے ظالم کو اپنا یار کیا	وله	ہم نے کیا جبر اختیار کیا
اُٹھ اے طبیب جا مجھے آرام ہو چکا	وله	مرتا ہوں کوئی دم کو مرا کام ہو چکا
اب بھی کہیں اُٹھا دیگا چہرے سے زلف کو		معمور تو شکار سے یہ دام ہو چکا

لینا تھا اُس کو دل سو لیا اُن نے نامہ بر		اب میرے اُسکے نامہ و پیغام ہو چکا
تنہا یہ عشق میں نہ دلِ ناتواں جلا	وله	مانند نخل شمع ہر اک استخواں جلا
نہ دل رہا نہ چشم رہی نہ جگر رہا		اے اشک تیرے ہاتھ سے کیا کیا مکاں جلا
وہ کیا ہوا زمانہ رونے میں جو اثر تھا	وله	یہ چشم خوں فشاں تھی یہ دل یہی جگر تھا
غش آگیا وہ سامنے میرے جہاں ہوا	وله	مجھ کو وصال یار میسّر کہاں ہوا
بے طاقت اس قدر یہ دل ناتواں ہوا	وله	حرفِ تواں بھی اُس کی زباں پر گراں ہوا
سر پر کھڑا ہے کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں		جلّاد میری جان کا یہ آسماں ہوا
ہزار پیار کرے گا ہزار چاہے گا	وله	مری طرح نہ کوئی تجھ کو یار چاہے گا
کوئی اس غم کدہ میں اپنی غمخواری نہیں کرتا	وله	دیا ہے ایک کو دل وہ بھی دلداری نہیں کرتا
جو ترے سامنے آئے ہیں سو کم ٹھہرے ہیں	وله	یہ ہمارا ہی کلیجا ہے کہ ہم ٹھہرے ہیں
ایک عالم کی جاں خراش ہی یہ	وله	آہ ہے یا قلم تراش ہے یہ
رو دیئے تا ہو سبز کشت اُمید		اب تردد ہے یہ تلاش ہے یہ
دیدۂ تر کو دوست رکھ جوشش		بہت تحفہ گلاب پاش ہے یہ
اپنی وہ بے ثبات ہستی ہے	وله	کہ سدا نیستی کو ہستی ہے
نام سنتے ہو جس کا ویرانہ		وہی سودائیوں کی بستی ہے
جی میں جس وقت کہ مضمون کمر آتا ہے	وله	بسکہ نازک ہے مجھے باندھتے ڈر آتا ہی
چشم تر آہ بہ لب خستہ جگر ہوں جوشش		بے طرح حال مرا مجھ کو نظر آتا ہے
شبنم کی طرح سامنے اُس آفتاب کے	وله	ہونے کو تو ہوئے تھے ولیکن نہ ہو سکے
کچھ کام نہیں ہمیں وفا سے	رباعی	تو ہاتھ نہ کھینچیو جفا سے
کل سب سے گلے گلے ملے تم		تھے ہم بھی تو صورت آشنا سے
چشم سے غافل نہ ہوا چاہیئے	وله	اس کے مقابل نہ ہوا چاہیئے

دل کا ضرر جان کا نقصان ہے		اب کہیں مائل نہ ہوا چاہیے
فرہاد یہ سب بے فائدہ خارا شکنی ہے	وله	گھر کیجیے کس دل میں یہی کوہ کنی ہے
نہ کوئی دوست ہے نہ کوئی مرا دشمن ہے	وله	ایک یہ دل ہی غرض دوست ہے یا دشمن ہے
ایک دن کا ماجرا ہی میں اٹھا تھا سیر کو	قطعه	دیکھتا کیا ہوں یہ جھگڑا ہے برسر بازار ہے
برہمن کہتا ہی بت خانے میں ہی ذات خدا		شیخ کہتا ہی غلط کعبہ ہی میں وہ یار ہے
اس میں جوشش بول اٹھا سنتے ہو شیخ و برہمن		جانے دو اپنی طرف دیکھو یہ کیا تکرار ہے
ممکن نہیں کہ دیکھیے روئے شگفتگی	وله	جبتک برنگ غنچہ گریباں نہ پھاڑیے
جاہ و حشم کی خواہش دولت کی آرزو ہی	وله	دو دن کی زندگانی تس پر یہ جستجو ہے
صورت پرست ہوں میں مانند آئینہ کے		جو کچھ ہے میرے دل میں سو میرے روبرو ہے
کہتا ہوں درد دل تو وہ کہتا ہی کیا مجھے	وله	چپ رہیے بس زیادہ نہ باتیں بنائیے
لاکھوں ہی کیے قتل گنہگار مجھی سے	وله	رہتی ہے مڑی اک تری تلوار مجھی سے
کوئی سوائے شانہ وہاں چھوٹتا نہیں	وله	دیکھو تو کوئے زلف میں کیا بند و بست ہے
کشور عشق میں رسوا سر بازار ہوئے	وله	اس کے ہاتھ آپ بکے جس کے خریدار ہوئے
میں آنہ سکوں اور صبا جا کے رہی ہے	وله	کوچہ میں ترے یار عجب با وہی ہے
جی چاہے تو ملئے جو نہ چاہے نہ ملئے	وله	دل میں تو ہمارے نہ یہی ہی نہ وہی ہے
جوشش تو یہاں تک ہوا رسوائے خلائق		جو دیکھے ہے کہتا ہے یہ دیوانہ وہی ہے
دل میں بھری ہی آگ اور آنکھوں میں آب ہے	وله	مانند شمع حال ہمارا خراب ہے
دیکھا ہے جب سے زلف کو شانے کے ہاتھ میں		جوشش ہمارے دل کو عجب پیچ و تاب ہے
اے عشق مجھے خوار کیا کیا کیا تو نے	وله	رسوا سر بازار کیا کیا کیا تو نے
جس طرح دل کا داغ جلتا ہے	وله	اس طرح کب چراغ جلتا ہے
اس رخ صاف کے آگے جو کبھی آتا ہے	وله	آئینہ اپنا ہی منہ دیکھنے لگ جاتا ہے

ہوئے صحرانشیں تشریف لاوے جس کا جی چاہے
در و دربان نہیں رکھتے ہیں آوے جس کا جی چاہے

وله

گرہ میں غنچوں نے نافے کے نافے باندھ لئے
چمن میں کھل جو گئی زلف مشک بو تیری

وله

مرنا تو بہتر ہے جو مر جائیے
جی سے کسی کے نہ اُتر جائیے

سوئے حرم یا طرفِ بت کدہ
الغرض اے شیخ جدھر جائیے

وله

نت نئے عذر ہیں نہ آنے کے
ہم دیوانے ہیں اس بہانے کے

وله

قطرے مرے آنسو کے ہیں اک لختِ شرر سے
کیا آگ برستی ہے مرے دیدۂ تر سے

وله

آشنا جب سے ہوئے اُس بتِ ہرجائی سے
دربدر خاک بسر پھرتے ہیں سودائی سے

وله

رباعی

گر جان دے کوئی پر نہ اس کے ہونگے
جی شوق سے لیں گے اس کا جس کے ہونگے
جوشش نہ رکھ ان بتوں سے ہرگز اُمید
یہ کس کے ہوئے ہیں اور کس کے ہونگے

بابُ الحاء

۱۔ حاتم

حاتم تخلص، شاہ جہان آبادی مشہور ریختہ گویوں میں سے ولی کے تھا۔ ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور میرزا رفیع سودا کا، شاعر خوش بیان تھا، صاحب دو دیوان تھا، ایک دیوان میں نہایت خرچ ایہام کیا ہے، اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے طور متاخرین اور طرز ایہام کا۔

گلشن اُس گل بن مری نظروں میں ویراں ہو گیا
جھاڑ جھاڑ اور بوٹا بوٹا دشمنِ جاں ہو گیا

ایک نے پائی نہ اب تک نبض کی رفتار حیف
دردِ میرا تختۂ مشقِ طبیباں ہو گیا

اشک خوں آلودہ میرے اس قدر جاری ہیں آج
جا بجا لعلوں سے ہندستاں بدخشاں ہو گیا

شور دریا تک ملاحت کا تری پہنچا ہے شور
بے نمک آگے ترے لب کے نمکداں ہو گیا

فیض صحبت کا تری حاتم عیاں ہے ہند میں
طفلِ مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہو گیا

وله

سجن سے یاد کر نامہ لکھا اور ہم رہے غافل
بجا ہے معذرت لکھنا ہمیں کاغذ خطائی پر

ہجر میں زندگی سے مرگ بھلی	وله	کہ کہیں سب جہاں وصال ہوا
مثالِ بحر موجیں مارتا ہے	وله	لیا ہے میں نے اس جگ سے کنارا
بالے پن سے مجھے سودا ہے ترے گیسو کا	وله	بال باندھا میاں بندا ہوں ترے گیسو کا
مجھے درکار نہیں مشک و عنبر و صندل	وله	ہوں دیوانہ میں پری رو کے چونکے لوکا
زور چیتا ہے مرے دل کا کبوتر حاتم بہت ہے عاقل		ہیرت کرتا ہے جب اُڑتا ہے اُسی کے کو کا خیال
ہر اک سخن ہوا ہے ہمارا مثالِ قند	وله	شیریں لبوں کے جب سے بوسے لئے ہیں ہم
ترے رُخسار و قد نے دھوم ڈالا ہے گلستاں میں	وله	اُدھر بلبل سسکتی ہے اِدھر قمری بلکتی ہے
دو چار اب تجھ سے کیونکر ہوئے ہم چشمی کے دعوے سے	وله	کہ نرگس کی چمن میں دیکھ کر گردن ڈھلکتی ہے
پری ہم جان کر اُس کو چھپائے شیشہ خالی میں		یہ تو بھی دخترِ رز پردۂ مینا سے تکتی ہے
جب سے تمہاری آنکھیں عالم کو بھائیاں ہیں	وله	تب سے جہاں میں تم نے دھومیں مچائیاں ہیں
زلفوں کا بل بتانا آنکھیں چُرا کے چلنا		کیا کج ادائیاں ہیں کیا کم نگاہیاں ہیں
حاتم کے بن اشارے سچ کہہ یہ چشم و ابرو		کس سے لڑائیاں ہیں کس پر چڑھائیاں ہیں
تمہارے غنچہ لب کے شوق میں گلشن کی سب کلیاں	وله	چمن میں سُن خبر آنے کی استقبال کو چلیاں
لگن میں تجھ ستمگر کے عجب مجلس میں غم گذرا		شمع رو رو کے ساری رات سرتا پا کھڑی جلیاں

۲ - حزیں

حزیں تخلص، میر باقر نام، متوطن شاہ جہان آباد۔ شاگردوں میں میرزا جان جاناں مظہر کے تھے، دلّی سے جب جدائی انہوں نے لاچار کی، تو عظیم آباد میں بود و باش اختیار کی۔ رفیق تھے نواب با فرہنگ سعید احمد خاں صولت جنگ کے، زندگی بسر کی ہے انہوں نے ساتھ رعایت نام و ننگ کے۔ بہت فہمیدہ اور آشنائے درست، دوستیوں میں نہایت چالاک و چست۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، خلاصہ اشعار ان کے دیوان کے لکھے گئے یہاں ہیں ◆

غم نے آباد کیا خانۂ ویراں میرا		ابر مژگاں سے ہوا سبز بیاباں میرا
یہ کہہ کے باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت!	ولہ	لکھا تھا یوں کہ فصل گل میں چھوڑیں آشیاں اپنا"
گوارا ہو گیا دل پر ہمارے جور یار آخر	ولہ	ہمیں رنج و الم سے ہو گئے صحبت برآ آخر
غم نے لیا ہے گھیر مجھے یاں تلک کہ اب	ولہ	دیتا ہے ساتھ دینے سے مجھ کو جواب دل
فصل گل آخر ہوئی، کیا دیکھ ہوں گے شاد ہم	ولہ	کچھ کر اے صیاد، اب ہوں گے نہیں آزاد ہم
رحم آتا ہے مجھے اس مشت خاک اپنی پہ ہائے!		خوبرویوں کی ہوائیں ہو چکے برباد ہم
اس بے وفا کے ہاتھ سے کچھ مجھ کو حُبّ نہیں	ولہ	پاؤں تلک بھی ہائے مجھے دست رس نہیں
ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ اب		چاہیں کہ جل مریں، تو کہیں خار و خس نہیں
کچھ کہا شاید اُن نے قاصد سے	ولہ	دل پہ ہے کہ وہ اضطراب نہیں
آوے نہ کیونکہ رشک مجھے برگ پان سے	ولہ	لیتا ہے کیا مزہ وہ سجن کے لبان سے
نہ وصل میں اُسے راحت، نہ ہجر میں آرام،	ولہ	کسی طرح سے حزیں دل کے تئیں قرار نہیں
تو نہ ڈر ٹک اُٹھا نقاب کے تئیں	ولہ	میں سمجھاؤں[1] گا اضطراب کے تئیں
کیونکہ خاطر خواہ دل کے درد کی تقریر ہو	ولہ	کب یہ معنی لفظ میں آتے ہیں، کیا تحریر ہو
کچھ گئی ہجر میں، کچھ وصل میں گریاں گزری	ولہ	کیا مری عمر کی اوقات پریشاں گذری
خوباں کے درد و غم نے کیا ناتواں مجھے	ولہ	یاں تک کہ مو بھی تن پہ ہوئے ہیں گراں مجھے
کیوں کر کروں جفا کی شکایت میں اُس ستی		کرتا ہے وہ وفا میں کبھو امتحاں مجھے
وفا میری اگر جور و جفا تجھ کو نہ سکھلاتی	ولہ	تو کیا آرام سے یہ زندگانی ہائے کٹ جاتی
حزیں میں دردِ دل کا کس طرح ظاہر کروں اُس سے	ولہ	مجھے کہتا ہے "تیری بات مجھ کو خوش نہیں آتی"
مجھے کہتا ہے "تیرا دل کہاں ہے"	ولہ	قیامت شوخ ہے یہ بدگماں ہے

[1] یہ لفظ تقطیع میں نہیں آسکتا۔ غالباً "سنبھالوں" ہو گا۔

۴۔ حسرت

حسرت تخلص، میرزا جعفر علی نام، متوطن شاہ جہان آباد کے، بیٹا میرزا ابو الخیر کا تھا۔ صاحب قصاید و دیوان ہے، اور سر حلقۂ موزونان خوش بیان ہے۔ اکثر کو مشق لکھنؤ کے مع جرأت دم شاگردی کا مارتے ہیں، اور یا اُستاد کہہ کے پکارتے ہیں۔ نخاس کے اندر دُکان عطاری کی یہ عزیز رکھتا تھا، اور اوقات اسی وجہ حلال سے بسر کرتا تھا۔ ۱۲۱۰ سنہ بارہ سو دس ہجری میں تختہ بند کرکے دُکان وجود کو سیر بازار عدم کی ہے، خدا بخشے اس عاقبت محمود کو۔

اتنا سودا یہ دل زار ہوا، کچھ نہ ہوا کاشکے عشق جتاتا نہ میں اس کو حسرت		کچھ بھی یہ عشق سے بیزار ہوا، کچھ نہ ہوا میری صورت سے وہ بیزار ہوا، کچھ نہ ہوا
بچا تجھ کو مریضِ عشق سے ملتے حذر آیا۔	ولہ	کہ آئینے میں شکل اپنی جو دیکھی مجھ کو ڈر آیا
رقیبوں کے حوالے کرکے خط کو نامہ بر آیا	ولہ	عزیزو کیا کہوں قاصد تو میرا کام کر آیا!
نہیں غنچوں پہ شبنم، اس دہن کے وصف نے ہم کو		یہ لذت دی کہ پانی منہ میں ہر غنچہ کے بھر آیا
اسی جہان میں رکھتے ہیں ہم جہان جدا	ولہ	حباب وار ہے اپنا بھی آسمان جدا
تری فرقت میں ہے شام و سحر مجھ کو عجب مشکل	ولہ	جو شب کاٹی تو دن مشکل، جو دن کاٹا تو شب مشکل
کرم سے کھول جو عقدے پڑے ہیں کام میں میرے		ترے آگے ہیں سب آساں، مرے آگے ہیں سب مشکل
ہوئے ہم بت کے بندے، برہمن سے راہ کرتے ہیں	ولہ	حرم کے رہنے والو! تم سے عشق اللہ کرتے ہیں
جلے جوں شمع، اب نزدیک ہے خاموش ہو جاویں[۱]		یہ افسانہ سنا کر قصہ ہم کوتاہ کرتے ہیں
تصور نے ترے ظالم یہاں تک تفرقہ ڈالا	ولہ	کہ ملنا ہو گیا دشوار اب مژگاں سے مژگاں کو
برنگِ آبلہ اے واے یہ کیا زندگانی ہے	ولہ	کہ جس کے پاؤں پڑتے ہیں اسی کو سرگرانی ہے

لہ اصل مسودہ میں اسی طرح املا لکھا ہے ۱۲

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کروگے تاراج کیا صبر و دل و جاں پھر اب آگے	ولہ	لو دل تمہیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کروگے کیا خاک بچی ہے جسے برباد کروگے
ترے بن کس طرح پیارے مری اوقات گذریگی	ولہ	ابھی سے دل کو بیتابی ہے، کیونکر رات گذریگی
کیا راہ میں غیروں سے ملاقات لگائی اُلٹا جو زمانہ ہے تو اس صید نے دل کے	ولہ	جو صبح سے یاں آنے تلک رات لگائی صیاد کے ملنے کے لئے گھات لگائی
اس زلف میں جا وفات پائی	ولہ	اس دل نے عجب ہی رات پائی
ہمارے کام پہ ہر چند آسمان پھرے چلا تھا لشکرِ غم چڑھ کے گھر پہ مجنوں کے	ولہ	تجھے قسم ہے! جو تو اس طرف کو آن پھرے مجھے جو دیکھا تو وہیں ادھر نشان پھرے
دل وردِ بتاں سے آہ کیونکر نہ کرے وہ شکل ہے جیسی دشمنوں میں گھایل	رباعی	پر آہ تو تب کرے جو اس سے نہ ڈرے دم لیوے تو سر کٹے، نہ دم لے تو مرے

مہ حیرانؔ

حیرانؔ تخلص، میر حیدر علی نام، ساکن شاہ جہان آباد کے۔ شاگرد رائے سرب سنگھ دیوانہ تخلص اُستادؔ[۲] کے۔ علمِ شعر سے تو بخوبی آگاہ نہیں ہیں، لیکن اشعار ان کے سب کے سب دلچسپ اور شیریں ہیں۔ بندش شعر کی ان کے اُستادانہ ہے، استاد جانتا ان کو ایک زمانہ ہے۔ نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں مرحوم کی امارت میں، اگرچہ نوکر وزیر الممالک نواب آصف الدولہ مغفور کے تھے، لیکن رائے میکو لعل سے کہ مالک واصلباقی کا تھا، توسل رکھتے تھے۔ بعد رائے مذکور کے مرنے کے ایک آدھ برس تو تنخواہ کی طرف سے اذیت اُٹھائی، پھر تو ایک مرتبہ نواب آصف الدولہ مرحوم سے کچھ ایسی موافقت آئی کہ پچاس کے سو روپے اضافہ کیا، اور سو سوار کا رسالہ۔ بالفعل

ل یہ مصرعہ جرأت کی طرف بھی منسوب ہے ۱۲ ع۲ اس فقرہ میں قافیہ کی پابندی سے سخت تعقید پیدا ہوگئی ہے مطلب یہ ہے کہ سرب سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے، اور جو اُستاد فن ہیں، حیراںؔ ان کے شاگرد ہیں ۱۲

کہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، مع رسالہ تنخواہ لکھنؤ میں لیتے ہیں، اور داد عیش کی دیتے ہیں۔ یہ اشعار اس ستودہ اطوار کے ہیں ❊

گر یہی وضع ہے، اور یہی ہیہات نصیب!
تو ہمیں ہو چکی بس اس سے ملاقات نصیب!
ہم لبِ گور ہوئے خوں یہ جگر اس غم سے
کرنی اس غنچہ دہن سے نہ ہوئی بات نصیب!
صبح ہر روز اسی غم میں ہمیں ہوتی ہے شام
آہ جا گینگے مرے کون سی اب رات نصیب!
کچھ ہمیں شکوہ نہیں جور سے تیرے کہ ہرگز
ہم ہمیشہ سے ہیں اے جان کچھ اوقات نصیب!
مسجدوں میں پھرے نت سبحہ پھرا تے حیراں
شیخ جی پر نہ ہوئی تم کو کرامات نصیب!

ولہ
ہوا نہ ہم کو کبھی سیرِ باغ و کشت نصیب
کریں گے زیست کا کیا یاد ہم سے زشت نصیب
دلِ ستم زدہ کا آج پوچھتے ہو حال
غمِ فراق سے کب کا ہوا بہشت نصیب

ولہ
اپنے جانے کا وہاں دن کو ہی نہ رات کو ڈھب
دیکھئے کیسے بنے آن پڑی بات کڈھب
وردِ دل غیر کے ہونے سے نہ کہنے پایا
کل میسر ہوئی حیران کو ملاقات کڈھب

دُکھ اُس سے کون کہے، تاب التماس کہاں
ولہ
کسے ہے ہوش بجا، دل کدھر، حواس کہاں!
ہوا ہے اب تو نئے دوستوں سے ربط ودے
تمہیں اب آنے کی فرصت ہمارے پاس کہاں

کلیجا بھُن گیا۔ کب تک کروگے ہائے بیدادی
ولہ
اُٹھوں میں ہی جہاں سے، یا کہ یہ اٹھ جائے بیدادی

کل کہا میں نے میرے گھر چلئے
سُن کے تیوری بدل لگا کہنے
مجھ کو کہتا ہے میرے گھر چلئے

ولہ
اس میں کچھ کم نہ ہوگی محبوبی"
"رسم و راہِ ادب تو سب ڈوبی
دیکھیو اختلاط کی خوبی"

۵۔ حسرت

حسرت تخلص، ہیبت قلی خاں لقب، ساکن عظیم آباد کے۔ شاگرد میرزا جان جاناں مظہر کے تھے۔ چند روز انھوں نے رفاقت نواب شوکت جنگ کی، کہ خلف نواب صولت جنگ

ناظم پرگنہ کے تھے، کی ہے۔ اور کچھ دنوں ان کو خدمت عرض و معروض کی نواب سراج الدولہ ناظم بنگالہ کے حضور میں رہی ہے۔ سنہ ۱۱۹۵ گیارہ سو پچانوے ہجری کے اندر نواب مبارک الدولہ میر مبارک علی خاں بہادر صوبہ بنگ کی رفاقت میں نہایت غربت اور پریشانی کے ساتھ اوقات بسر کرتے تھے سنہ ۱۲۱۰ بارہ سو دس ہجری میں اس سرائے فانی سے سفر کر گئے۔ بڑے ہی لطیفہ گو اور حاضر جواب تھے، بذلہ گوئی اور علم مجلس میں انتخاب تھے۔ قریب دو ہزار بیت کے دیوان اس عالی دودمان کا ہے۔ یہ انتخاب ان کے دیوان کا ہے +

رات کا سچ ہوا یہ خواب مرا — دل گیا صبح آفتاب مرا
بیترے کوچہ سے باز نہیں آتا — یہ دلِ خانماں خراب مرا

وله
نہ جانوں کرے گیا حنا کا لگانا — لہو پانی کرتا ہے یہ پان کھانا

وله
عجب طرح کا عشق حسرت نے ٹھانا — کبھی اُس کے کوچہ نہ آنا نہ جانا

وله
بسکہ دُکھ دیتا ہے میرے دل کو وہ بدخو مرا — کل نہیں پاتا ہے مارے درد کے پہلو مرا

وله
دل ہوا غم میں آب کی سی طرح — پر جلے ہم شراب کی سی طرح
ہاتھ میں جام لے ملا مجھ سے — صبح کو آفتاب کی سی طرح

وله
چھپاؤں اشکِ گلگوں کس طرح ہائے! — گریباں ہو رہا ہے جابجا سُرخ

وله
اشک پر اشک چلا متصل آوے باہر — یہاں تلک روئے آنکھوں سے دل آوے باہر

وله
بعد مرنے کے ہماری خاک کو برباد کر — دے بگولے کو کہ لے مجنوں کا گھر آباد کر

وله
ترے جمالِ جہاں گیر سے بنے کیوں کر — میں ایک تیرا دیوانہ[۱]، ترا ہزار میں دل

وله
زلف و رخِ یار دیکھتا ہوں — کیا لیل و نہار دیکھتا ہوں
پھر یار سے ان دنوں ہیں بارے — صحبت کو برآر دیکھتا ہوں

۱؎ اس لفظ کو قدما کے لہجہ کے موافق بہ وزن دوانہ پڑھنا چاہئے ورنہ مصرع ناموزوں ہوگا ۱۲

آپ ہی اپنے یار تھے، جانا نہیں	ولہ	غیر ہیں بھولے تھے پہچانا نہیں
ہم نہ ہوں، تو ہو، تو شب چرچا کریں	ولہ	شمع ہے محفل میں، پروانہ نہیں
کعبہ بھی ہم گئے، نہ گیا ان بتوں کا عشق	ولہ	اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں
مر گئے انتظار کے ہاتھوں	ولہ	کیا کہیں! اپنے یار کے ہاتھوں
پھر مسیحا دمی کرے تو اٹھیں		سو کہاں روزگار کے ہاتھوں
فرہاد سے ہمسری کرے کون	رباعی	سر کس کا پھرا ہے یوں مری کون
چل کشمکشِ جہاں سے حسرت		ہوتا رہے نت ورے پرے کون
سدا بارش ہی میں رہتی ہیں میری چشم تر ساون	ولہ	تو ایک دو دن برس کر ہم سے آ سکتا ہی برسا دن
اڑا دے اے دوانے! شورشِ سودا سے سب ڈر کو	ولہ	بہار آئی، تو کیدھر دیکھتا ہے، پھونک دے گھر کو
مجھے افراط رقت میں بجا نہیں بات کر آئی	ولہ	کہ کر سکتا نہیں ڈوبا ہوا تقریر پانی میں
سنا ہے آج میخانہ میں جامِ مے پرستوں نے	ولہ	لٹایا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں
ہم دوانوں کے نہیں عشق میں گھر جلتے ہیں	ولہ	اس محبت میں پرندوں کے بھی پر جلتے ہیں
دیکھ اس لب کو ترے، آگ ہیں لعل و یاقوت		تیرے ان دانتوں کی جھلکی سے گہر جلتے ہیں
ان پتنگوں کی ہیں جرأت پہ موا جاتا ہوں		بے کلیجے ہیں یہ کمبخت، قہر جلتے ہیں
تو جو ل گرمیاں کرتا ہیگا مجھ سے ہر دم		دیکھنے والوں کے حسرت سے جگر جلتے ہیں
نہ جی لگا یئو اس سے جو دردمند نہ ہو	ولہ	کسی کا دل کسی ظالم کے پاس بند نہ ہو
گو دل بروں کے ماہ سے رخ پر نقاب ہو	ولہ	پوشیدہ ہو سکے ہے جو کوئی آفتاب ہو
لبِ بام آکے یہ تیرا کھڑے رہنا تو آفت ہے	ولہ	سوا نیزے پہ گویا آفتاب آیا، قیامت ہے
داغ دل پھیر تازگی پہ ہوئے	ولہ	اب شگوفہ بہار کرتا ہے
ترا غرور مرے عجز کے مقابل ہے	ولہ	ادھر بہار، ادھر ایک شیشۂ دل ہے
پلا شراب، ہوائے شراب آتی ہے	ولہ	گھٹا بھی اپنا جھمکڑا کھڑی دکھاتی ہے

لے اُڑا کام اپنا پروانہ	وله	ہائے ہم بال و پر نہ رکھتے تھے
جیسے بھٹکے پھرا کئے حسرت		یار کے دل میں گھر نہ رکھتے تھے
قفس ہی میں ہمیں رہنے دے صیاد	وله	کہاں اب اُڑ سکیں جب بال و پر گئے
تجھے کچھ بھی ہے حسرت فکرِ دل کی		کہاں کھویا اُسے تو ہائے گھر گئے!
ناصح عبث ستامت، ہیں مبتلا کسو کے	وله	کچھ دل بھی گیا پھرے ہی، پھیرے سی گیا کسو کے
یہ گل ہزار اپنے جامے میں پھول بیٹھے		ویسے کھلے نہ دیکھے بندِ قبا کسو کے
جدائی کی ہوا دہکا گئی اب آگ سینے کی	وله	لگے اُڑنے بھبوکے آہ کے، کیا طرح جینے کی
ناشاد کا میرے حال جیسے نہ گیا	رباعی	جی تک میں دیا، ملال جی سے نہ گیا
یہ لوح مزار پر ہماری لکھنا		"ہم گئے، پہ ترا خیال جی سے نہ گیا"
زاہد جو نہیں ہے میرے دل سے آگاہ	رباعی	کہتا ہے کہ "کافر ہے تو اے روئے سیاہ"
ہوں جس کی پرستش میں کہوں کیا یارو		آتا ہے وہ بت، دیکھو اللہ! اللہ!
کب شہر کو چھوڑے، جو سیانا ہو گا	رباعی	صحرا دیکھے گا، جو دوانا ہو گا؛
ہم دونوں میں سیر کر کے دیکھا حسرت		رہنا تو وہاں، جہاں کہ جانا ہو گا
میخانہ میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی	رباعی	زاہد و واعظ سے دور، بھٹکی بھٹکی
قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے ہرگز		یہ دخترِ رز ہے جس سے اٹکی اٹکی

٦۔ حسن

حسن تخلص، خواجہ حسن نام، متوطن شاہ جہان آباد کے، بیٹے خواجہ ابراہیم بن غیاث الدین بن محمد شریف بن ابراہیم کے ہیں۔ جو کہ مشہور خواجہ کمہار کر کے تھے۔ چشتی اور ساکن پہاڑ گنج ہیں۔ بڑے ہی لطیفہ گو اور بذلہ سنج ہیں۔ علم موسیقی ہندی سے بخوبی ماہر، اور استعداد اس علم کی ان کی تصانیف سے ظاہر۔ علم نجوم میں بھی دخل بھلا چنگا رکھتے ہیں۔ اور فقر و درویشی میں

تو آدھا لکھنؤ معتقد اپنا رکھتے ہیں۔ علوم متداولہ سے بھی خوب آگاہ ہیں، خصوص علم تصوف کے بادشاہ ہیں۔ توسل امورات دنیا میں ان کو نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خان سے ہے، اور یوں ملاقات تو ایک جہان سے ہے۔ بخشی نام ایک رنڈی ارباب نشاط سے ہے، اُس پر مرتے ہیں، اور اکثر نام اُس کا مقطع میں غزل کے داخل کرتے ہیں۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں۔ کچھ اشعار منتخب ان کے لکھے گئے یہاں ہیں ٭

حال دل اپنا میں ہر ایک سے کہوا دیکھا		وہاں کسی ڈھب سے پہ ہوتے نہ پذیرا دیکھا
وقت نظارہ نہ رو، کہتے تھے اے چشم تجھے		شدتِ گریہ سے، لے خاک نہ سوجھا، دیکھا
گھورتے ہو مجھے کیا قہر کی آنکھوں سے تم		ایک عالم نے آپ کو گھورا دیکھا
دیکھنے سے مرے کاہے کو غضب ہوتے ہو		کیا غضب ہو گیا گر میں نے بھی دیکھا دیکھا
تب اس حیلہ گر کو نہ کچھ کام ہوگا	ولہ	کہ جب میرا یہاں کام اتمام ہوگا
یہی شورشِ عشق ہے تو الٰہی!		اس آغاز کا کیوں کہ انجام ہوگا
رہی بے قراری اسیروں کی یونہیں		تو صیاد! ٹکڑے ترا دام ہوگا
موئے ہم تو، پر بے قراری وہی ہے		خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا
اگر نزع سے جان بخشی حسن کو		تو اس میں تمہارا بڑا نام ہوگا
جو بندہ خانے میں آئیے گا، فقیر تم کو دعا کریگا	ولہ	کسی کے دل کو جو خوش کرو گے، خدا تمہارا بھلا کریگا
عالم اُس حور کی جو جلوہ گری کا دیکھا	ولہ	پھر یہ جلوہ نہ کسی حور و پری کا دیکھا
پہنچے وہاں کچھ جب تئیں پیغام ہمارا	ولہ	یہاں تب تئیں آخر ہی ہوا کام ہمارا
دل دلاسوں سے کرے ہے آہ و زاری بیشتر	ولہ	خانۂ ماتم میں ہو پُرسے سے زاری بیشتر
بھلا میں دوانہ سہی، پر یہ ناصح	ولہ	مرے ساتھ بکتا ہے، عاقل کو دیکھو
یہاں تھک کے بیٹھے ہو، گیا راہ میں تم		چلو راہ رو، اپنی منزل کو دیکھو
ٹک جلا دے ہمیں گویا ہوتا	ولہ	اے لبِ یار مسیحا ہوتا

میں تو سب طرح سے تیرا ہوں میاں — پر جو تو بھی کہیں میرا ہوتا
مانوں تب وعدۂ فردا اے یار — جب ترے وعدے کو فردا ہوتا
اے مرے اشک سر مژگاں پر — قطرہ کیا ہووے ہے دریا ہوتا
تو جو ڈھونڈھے ہے حسن خلوت کو — عین خلوت میں اکیلا ہوتا
سر گریباں میں جھکا دل میں بیٹھ — موند لے آنکھ کو تنہا ہوتا

ولہ
چلنے سے کب اشک ہارتا ہے — دریا ہے کہ جوش مارتا ہے

ولہ
آکر بلا سے قتل ہی کر جائیے مجھے — صورت اسی بہانہ سے دکھلائیے مجھے

ولہ
غم نے ایذا جو اے صنم بخشی — یہ بھی سرکار کی کرم بخشی

ولہ
حقیقت کہیں کیا ہم اس انجمن کی — نہ تھی واں خبر اپنے ہی تن بدن کی
اگر جاں کنی میں وہ جاں بخش آوے — تو ہو نزع سے جان بخشی حسن کی

ولہ
یہ تو نے مجھ سے نالۂ شبگیر کچھ نہ کی — یہاں دل جلایا، اور وہاں تاثیر کچھ نہ کی
کیوں تم خفا ہو، کب میں کسی بات پر میاں — ہو جب تمہارے قول کے تقریر کچھ نہ کی
کچھ اور تو ہوا نہیں ہی ساری عمر میں — تقصیر یہ ہوئی، کہ میں تقصیر کچھ نہ کی
مرتا ہی جاں کنی میں حسن حیف! تم نے رات — اب اس کی جان بخشی کی تدبیر کچھ نہ کی

ولہ
ٹک اپنا یہ رونے پہ اگر دھیان لگاوے — ساون کی جھڑی دیدۂ گریان لگاوے
شمشیر نگہ تیز ہے آگے ہی، جو چاہے — اور سنگ سی سرمہ کے فسان لگاوے
دن رات مری تجھ سے دعا ہے یہی یارب! — اُس بت کا مجھے آٹھ پہر دھیان لگاوے

ولہ
کب میں کہتا ہوں کہ میری جان جانے سے رہے — پر ٹک ایسا ہو کہ یہ دل تلملانے سے رہے
ہم نے ایسی بھی تو کچھ چوری نہ کی تھی آپ کی — بے سبب اب آپ جو ادھر کے آنے سی رہے
آہ کس کس بے وفائی کا میاں کیجے شمار — اَور تو سب یکطرف، منہ بھی دکھانے سی رہے
اُس نے کس کس طرح ٹالا ہم کو اپنے در سے پر — دیکھ تو ہم بھی حسن کس کس بہانے سے رہے

۷۔ حسن

حسن تخلص، میر غلام حسن نام۔ شاہ جہان آبادی۔ بیٹا میر غلام حسین ضاحک تخلص کا، اولاد ہی میر امامی ہروی کے۔ دلی کے پرانے شہر میں بود و باش رکھتے تھے۔ صغر سن سے وارد لکھنؤ میں ہوئے نواب سالار جنگ اور خلف اُن کے میر نوازش علی خاں سردار جنگ کی رفاقت میں اوقات انہوں نے ساتھ عزت اور غربت کے بسر کی ہے، اور اصلاح سخن کی میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے لی ہی اقسام علم سے تو جمیع علوم میں انہیں اقرار ہیچ مدانی ہے، ہاں مگر اشعار میں ان کے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے، قریب آٹھ ہزار بیت کے انواعِ نظم میں دیوان ان کا ہے، اور ایک تذکرہ بھی ہندی گویوں کا زبان ریختہ میں لکھا ہے۔ بے نظیر اور بدر منیر کے احوال میں کیا خوب مثنوی لکھی ہے، اور ۱۲۰۵ھ بارہ سو پانچ ہجری میں سیر روضۂ رضوان کی کی ہے۔

یہ اشعار منتخب دیوان ان تکو گردار کے ہیں +

گر کیجیے رقم کچھ تری وحدت کے بیان کا
تو چاہیئے خامہ بھی اُسے ایک زبان کا

وله

چھوٹا نہ وہاں تغافل اس اپنے مہرباں کا
اور کام کر چکا یہاں یہ اضطراب جاں کا

وله

نہ تھمتی تھیں آہیں، نہ تھمتے تھے آنسو
حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

وله

ایسی ہی آہ! باتیں اس بیوفا نے چھیڑیں
رونے ہی روتے جس میں روز وصال گذرا

وله

کچھ تو صدا ہی آہ! نہ خاک بھی، کہ جو
اُدھر کو لگ رہا ہی حسن گوشِ نقش پا

وله

اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہی میرا
جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا

وله

چھوڑ دے کوئی کسی کیلئے جس طرح سے کچھ
ہم نے منت میں تری کون و مکاں چھوڑ دیا

وله

اپنی جاگہ نہ ملے اور کہیں مجھ کو کیا
تیری خاطر سے میں آتا ہوں نہیں مجھ کو کیا

وله

وہ ملک دل کہ اپنا آباد تھا کبھو کا،
سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہو کا

وله

دامن صحرا سے اُٹھنے کا حسن کا جی نہیں
پانوں دیوانے نے پھیلایا، بیاباں دیکھکر

وله
اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے، تو کیا
ہو چکی وہاں بہار ہی آخر

وله
اُس شوخ نے پھینکا ہے مگر تیر ہوا پر
جاتا ہی جو دل کا مرے نخچیر ہوا پر

وله
دیکھا جو وہاں نہ اُس کو، گماں سو طرف گیا
آئے نہ ہووے کاش کہ ہم کو ڈھونڈتا

وله
آن کر غمکدۂ دہر میں جو بیٹھے ہم
شمع ساں اپنے تئیں آپ ہی رو بیٹھے ہم

وله
اس کی جب بزم سے ہم ہو کے بہ تنگ آتے ہیں
اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں
حسن ہیں جب تئیں گرمی نہ ہو، جی دیوی کون
شمع تصویر کے کب گرد پتنگ آتے ہیں

وله
اپنے دل سے تو کبھی ہم ترا شکوہ نہ کریں
ہو گر آزردہ تم ایسے ہی تو بولا نہ کریں

وله
ترے بن باغ میں جس وقت غنچے دل کے کھلتے ہیں
خراشِ ناخنِ غم سے جگر کے زخم چھلتے ہیں
نہ لیٹ اس طرح منہ پر زلف کو بکھرا کے ای ظالم!
ذرا اُٹھ بیٹھ تو اس دم کہ دونو وقت ملتے ہیں

وله
ہے ترا دل کی جو زلفوں کے گیا پھیرے میں
شب کو کیوں نکلا اکیلا، جو پھنسا پھیرے میں

وله
کہتا ہی تو کہ "تجھ سے میں ہی نباہتا ہوں"
تو بھی کہیں ہو تجھ سا ہمیں یوں ہی چاہتا ہوں

وله
مجھ پر ہی تیرا یہ ستم و جور کچھ نہیں،
لیکن ترا ہر ایک سے یہ طور کچھ نہیں
روٹھا کرے وہ کیوں نہ کسی اور سے حسن
یہ سب بگاڑ چاہ کا ہے، اور کچھ نہیں

وله
صیّاد کی مرضی ہی یہ اب گل کی ہوس میں
نالے نہ کریں مرغِ گرفتارِ قفس میں
وہ اور زمانہ تھا کہ خوباں میں تھی اُلفت
ایسا نظر آتا نہیں اب ایک بھی دس میں
دم رُکتا ہوا آتا ہی لب تک ترے غم سے
عقدے پڑے ہیں بسکہ مرے تارِ نفس میں
دل اپنا اسی باتوں سی اُٹھ جاتا ہی تجھ سے
جا بیٹھے ہی تو ل کے جو ہر ناکس و کس میں

وله
تیرے ہمنام کو جب کوئی پکارے ہی کہیں
جی دھڑک جاتا ہی میرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو

وله
غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو
کیا غضب کرتے ہو اُدھر دیکھو
دیکھنا زلف و رُخ تمھیں ہر وقت
شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

وله
کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گذرتی
پر ایک جان تو ہی جس بن نہیں گذرتی

وله
جان و دل ہیں اُداس سے میرے
اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

وله
ساتھ دیکھوں ہوں کسی کے جو کسی دلبر کو
میں بھی جی رکھتا ہوں مجھ کو بھی ہوس آتی ہے

وله
کیا چھپے سے پوچھے ہے کہ "گھر تیرا نہیں ہے!"
کہنے کو تو گھر یہاں ہے، پہ جی اپنا وہیں ہے

وله
سیر ہے تجھ سے مری جان جدھر کو چلیئے
تو ہی جب ساتھ نہ ہووے تو کدھر کو چلیئے

جب میں چلتا ہوں ترے کوچہ سے گھبرا کے کبھی
دل مجھے پھیر کے کہتا ہے "اودھر کو چلیئے"

وله
نغمۂ عشق سے ہیں سبحۂ و زنّار ملے
ایک آواز پہ وو ساز کے ہیں تار ملے

دن توقع ہی توقع میں کہاں تک گذرے
مر گئے ہجر میں، بس اب تو کہیں یار ملے

جی تو ایسا ہی خفا تھا کہ نہ ملیئے گا کبھو،
پر ترے ہنس کے لپٹ جانے میں ناچار ملے

وله
گر بخت اپنے جاگیں تو اک کام کیجئے
سایہ میں اُس کی زلف کے آرام کیجئے

اب میں بھی سب بے قراری پر اپنی لیا قرار
بس خیر! آپ شوق سے آرام کیجئے

وله
بھولے سے نام لے کے مراہٹ بتا گیا
پیاری لگی یہ مجھ کو تری بات آج کی

وله
کئی دن ترے چپ رہنے میں اشک آنکھوں سے برسائے
نکل خورشید رو گھر سے کہ عالم خوب ترسائے

وله
ترا ہر چند دل تجھ سے بھی کچھ سخت ترسا ہے
ولیکن سخت اگر کہیئے، تو کب میرے جگر سا ہے

گریباں چاک اور خاموش مجھ کو دیکھ کہتا ہے
"کروں کیا بات اس سے، یہ تو کچھ دیوار در سا ہے!"

وله
رہنے نہ دے گا اُس بن یہ دل تو ایک دم بھی
کیوں روٹھ کر ہم اپنا کھوئیں عبث بھرم بھی

وله
دریا میں ڈوب جائے، کہ یا چاہ میں پڑے
اے عشق پر نہ کوئی تری راہ میں پڑے

آجا کہیں شتاب! کہ مانندِ نقشِ پا
تکتے ہیں راہ تیری سرِ راہ میں پڑے

وله
یوں غیر کچھ نہیں، تو بلا کو بری لگے
تو کچھ نہ کہہ، کہ ہم غربا کو بری لگے

وله
کیا ہنسے اب کوئی اور کیا رو سکے
دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

وله
رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا،
بس اے زندگی! ایسی ہستی سے گذرے

وله
آنکھوں کو اُس کی دیکھا تو ہستی نظر پڑی
پھر ساتھ اُس کے بادہ پرستی نظر پڑی

سارا جہاں خراب تھا آنکھوں میں تجھ بغیر | بارے وہ آج آیا تو بستی نظر پڑی

جو چاہے آپ کو تو اُسے کیا نہ چاہیئے | ولہ | انصاف کرو تو، چاہیئے یہ یا نہ چاہیئے

مجھ سے نے تجھ کو چاہا تو چاہا عجب نہیں | سمجھا جو مجھ کو چاہے، تو پھر کیا نہ چاہیئے

مژگاں سے جھاڑتے ہیں جو اُس گلی کے تنکے | ولہ | رہتے ہیں ہم دوانے روز ازل سے تنکے (یعنی اُن کے)

دنیا داری میں اور نہ دیں داری میں | رباعی | چاہت میں کسی کی ہیں، نہ بیزاری میں

حیرت کدۂ دہر میں تصویر کی طرح | سویا کرتے ہیں عین بیداری میں

ہر آن میں آپ کو دکھا جاتے تھے | رباعی | ہر لحظہ نیا شوق دلا جاتے تھے

کیوں دیر لگی ہے، کس نے روکا تم کو؟ | اب تک تو کئی بار تم آجاتے تھے

مثنوی در ہجو لکھنؤ و تعریف فیض آباد۔

نہیں یہ لکھنؤ، ہے یہ زمانا | زمانے پر عبث رکھنا بہانا

زبس یہ ملک ہے ہنجر یہ بستا | کہیں اونچا، کہیں نیچا ہے رستا

کسی کا آسماں پر گھر ہوا ہیں | کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ ہیں

زبس گنجان ہے یہ شہر باہم | سما سکتا نہیں ہی غیر کا دم

سیہ گل سے گلی یوں تر رہے ہی | بغل جس طرح زنگی کی بہے ہے

فراغت سے یہاں کس کا مکاں ہی | ہر اک گھر خس کا ساول یہاں ہی

کنواں بھی یوں ہے پھر اس تنگ گھر میں | پڑے پتلی کا تل جیسے نظر میں

کنواں کہنا اسے ہے عقل سے دور | کہ ہے اس گھر کی چھاتی کا وہ ناسور

کہوں کیا میں قدامت اس مکاں کی | پڑی بنیاد بعد اس کے جہاں کی

ہزاروں راہ اس میں پیچ در پیچ | ولیکن مثل زلف زشت رو ہیچ

جو اس کے زیر سایہ آن نکلے | رُکے دم، اور اُس کی جان نکلے

جو کوئی رات کو بھولے یہاں گھر | پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در

نہیں امکاں جو گھر اپنا وہ پاوے — بلا خورشید کو جب تک نہ لاوے
زبس کوفے سے یہ شہر ہم صدا ہے — اگر شیعہ کہے نیک اس کو بجا ہے
چڑھے ہے گومتی جب گرد آ کر — حباب آسا بہے پھرتے ہیں سب گھر
رکھے ہے پار ہو سکنا تب امکاں — چڑھے جب آدمی پر آدمی یہاں
سوائے قندیاں دیکھا نہ کچھ اور — سو ہے روپوش وہ بھی دیکھ یہ طور
چلا ہیں یہاں سے دل اپنا اُٹھا کر — کہ کیجے سیرِ فیض آباد جا کر
عجب معمورۂ آباد پایا — مثالِ گل ہر اک دل شاد پایا
کھلا بازار اور رستہ کشادہ — بیاضِ جدولی جیسے ہو سادہ
دو رستہ راستے میں آتا رستا — کسی نے آج تک دیکھا ہی بستا
وہ جی ہے شہر کا ترپولیا یوں — کہ جیسے تین رُوحیں جسم میں ہوں
ادھر کو جوہری، اُودھر کو بزّاز — ادھر صرّاف، اور اُودھر طلاساز
روپے اور اشرفی دیکھے برستے — دیئے تختوں پہ جوں نرگس کے دستے
یہ فیرنی (یعنے فیرنی) اور فالودے کا عالم — کہے تو چاند اور تارے ہیں باہم
ملا شربت میں جو اُس کو بتاوے — شبِ مہ کا سما پانی میں پاوے
ملائی دودھ کی دیکھو تو گویا — اُسی میں مال حلوائی نے کھویا
بلندی پر ہے حلوائی کی دکّاں — ستارے گرد ہیں جیسے چراغاں
دھری ہیں گولیاں اور یوں اندرسے — کہ گویا چاند اور تارے ہیں برسے
مٹھائی کی کروں تعریف تا چند — قلم کی ہو گئی اب تو زباں بند
ہزاروں خانگی اور کسبی آ کر — کریں ہیں سیرِ لالہ دل لگا کر
چمک دامن کی دکھلا یوں چلے ہے — کہ بجلی اپنے ہاتھوں کو ملے ہے
وہ سبزہ کان میں زیبِ بنا گوش — کہ جس کو دیکھ طوطی کے اُڑیں ہوش

شعاع اس کی یہ اور منہ کا پسینا	ہے گویا پھول پر شبنم کا مینا
کوئی کرتی ہے پہن جالی کی سادہ	گریباں کہہ کے چھاتی تک کشادہ
کیا اس دام میں تکمہ کو یوں صید	سحر کے جوں گریباں میں ہو خورشید
مسافر اس طرف جو آن نکلے	نہ نکلے وہاں سے غیر از جان نکلے

باب الخاء

۱۔ خاکسار

خاکسار تخلص، محمد یار نام، شاہ جہان آبادی۔ قدم شریف کے خادموں میں سے تھا، بڑا ہی مشّاق زبان ریختہ کا۔ ہمیشہ محمد تقی میر تخلص سے نوک جھوک کرتا رہا ہے، اور ان کے اشعار میں مشاعروں کے اندر اکثر تصرف کیا گیا ہے۔ صاحبِ دیوان اور شاعر خوش بیان تھا۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "شعر اس عزیز کے میرے ہاتھ نہیں لگے ہیں، اس جہت سے اشعار اس کے داخل اس تذکرے کے کمتر ہوئے ہیں"۔ یہ اشعار طبعزاد اس کہن اُستاد کے ہیں +

تھا زلیخا کو جو جاں سے مہِ کنعان عزیز	ہم نے بھی تجھ سے تو بے مہر نہ کی جان عزیز
کل مجھے قتل کر اُس دشمن دیں کافر نے	بولا لوگوں سے یہ تھا مرد مسلمان عزیز
کیوں نہ وہ مصحف رو جان سی مجھے ہووے زیاد	کس مسلماں کو نہیں دین اور ایمان عزیز
خاکسار عرش[1] سے بھی دیکھا پرے تیرا مزاج	آپ میں آ ذرا، اپنے تئیں پہچان عزیز

دل شیفتہ کر کے کیا لیا تو	ولہ	اے خانہ خراب! کیا کیا تو
تیری زلف سیہ سے اے پیارے	ولہ	مجھ کو یک سر ہزار سودا ہے
قیامت بھی ہو گی تو میری بلا سے	ولہ	مجھے داد خواہی کی طاقت کہاں ہے

[1] تقطیع میں عین گرتا ہے ۱۲

روونے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی	ولہ	اس خانماں خراب کو چپکا خدا کرے!
کیا ہے حاصل تجھے ناصح مرے سمجھانے سے	ولہ	آہ! جوں شمع ہے راحت مجھے جل جانے سے

بَابُ الدّال

۱۔ درد

درد تخلص، خواجہ میر نام۔ متوطن شاہ جہان آباد کے، خلف الصدق حضرت ناصر دہلوی کے۔ ثابت قدمی میں اس قطبِ آسمانِ استقلال کی، اور زاویہ گزینی میں اس مرکزِ دائرۂ فضل و کمال کی یہ نقل مشہور ہے، اور زباں زد جمہور ہے، کہ جس ایام میں معمورہ شاہ جہان آباد کا، اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتخبان عدیم المثال سے، رشک ہفت اقلیم اور غیرتِ جنت النعیم تھا، تو معموری پر شہر کی عرصہ ربع سکوں کا تنگ، اور وہ خراب آباد تشبیہ سے ہفت اقلیم کی تنگ تھا۔ جبکہ متواتر نزولِ آفات کے باعث، اور مکرر وردِ بلیات کے سبب خراب ہوا، اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا، تو ہر ایک درویش گوشہ نشین بنے، اور ہر ایک صابرِ زاویہ گزین بنے، اور ہر توانگر مالدار بنے، اور ہر امیر عالی مقدار بنے، فرار کو غنیمت جانا، اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا۔ مگر وہ سید والا تبار، کہ نام نامی اُس کا خواجہ میر تھا، اُس قطبِ آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوئے، اور شاہ جہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم اپنے کنج عزلت سے نہ گئے۔ اگر شیخ فرید شکر گنج اُس کوہ تحمل کو دیکھتا، تو چاشنیٔ فقر اُس کی حیران ہو کر مانند نیشکر کے انگشت تحیر کو کاٹتا۔ اور اگر سید حسین خنگ سوار بیچ اس عرصہ کے ہوتا، تو زین پوش خدمت کا اُس کے کاندھے پر ڈال کے دوڑتا۔

غرض اس مجمع فضل و کمال کی التفاتِ طبیعت طرف نظم کے نہ واسطے شہرت اور نام کے ہے بلکہ واسطے گرمانے افسردہ دلانِ خام کے ہے۔ اُس شہسوار معرکۂ سخنوری کے توسنِ تند خرام قلم نے بیچ قلمرو معنی آفرینی کے ایک گام بے راہی نہیں کی، اور اُس یکہ تاز عرصۂ مضمون

تراشی کے ست رنگ آسمان سیر خامہ سے بیچ میدان بلند مقامی کے ایک قدم کوتاہی نہیں کی تعجب نہیں ہے اگر اس عندلیب گلشن معنی کے کلام معجز نظام کی تحریر سے صفحہ کاغذ کا ہمرنگ برنگِ گل ہو، اور نغمہ زبانِ قلم کا ہم آہنگ صفیرِ بلبل ہو۔ اگرچہ دیوان ان کا بہت مختصر ہے، لیکن سراپا درد و اثر ہے۔ زبانِ فارسی میں بھی اکثر غزلیں کہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ رباعیوں کی طرف مسایل تصوف میں بیشتر طبیعت آئی ہے، اور شرح بھی اس کے مشکل مقاموں کی آپ ہی فرمائی ہے۔ طریقۂ فقر میں بہت بڑے کاسب اور شاغل تھے، اور راہِ طریقت کے طالبوں کے واسطے رہنماے کامل تھے بسنہ ١٢٠٢ بارہ سو دو ہجری میں اس بلبل گلشن آزاد نے دام ہستی سے نکل کر شاخسار کو چمنِ عدم کے آباد کیا ہے۔ یہ منتخب ان کے دیوان کا ہے +

مقدور کسے ہے ترے وصفوں کے رقم کا		حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن		آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا
مانند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی		کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا
اہل زمانہ آگے بھی تھے، اور زمانہ تھا	ولہ	پر اب جو کچھ ہے، یہ تو کسی نے سنا نہ تھا
باور نہیں ابھی تجھے غافل پہ عنقریب		معلوم ہووے گا کہ یہ عالم فسانہ تھا
یک بیک نام لے اٹھا میرا	ولہ	جی میں کیا اس کے آگیا ہوگا
گل و گلزار خوش نہیں آتا	ولہ	باغ بے یار خوش نہیں آتا
جاں پہ کھیلا ہوں میں، میرا جگر دیکھنا	ولہ	جی نہ رہے یار رہے، مجھ کو ادھر دیکھنا
ذکر وفا کیجئے اس سے کہ واقف نہ ہو		کہتے ہو کس سے یہ تم "ٹک تو ادھر دیکھنا"
باہر نہ آسکی تو قیدِ خودی سے اپنی	ولہ	اے عقل بے حقیقت! دیکھا شعور تیرا
جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی طرف یہاں		جی میں سما رہا ہے ازبس غرور تیرا
ہم نے چاہا بھی، پر اس کوچہ سے آیا نہ گیا	ولہ	واں سے جو نقش قدم دل کو اٹھایا نہ گیا
چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم	ولہ	"بہار باغ گو یوں ہی رہے لیکن کدھر شبنم"

تیری خون آشامیاں مشہور ہیں ای تیغ یار		ایک قطرہ چھوڑے تو پیوے ہمارا ہی لہو
اس ہنسی خراب سے کیا کام تھا ہمیں	ولہ	اے نشۂ ظہور! یہ تیری ترنگ ہے
نہ ہاتھ اُٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے	ولہ	کسے دماغ کہ ہو دو بدو کمینے سے
مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجاوے		کہ زندگانی عبارت ہی تیرے جینے کی
جو ملتا ہے ل، پھر کہاں زندگانی	ولہ	کہاں میں، کہاں تو، کہاں نوجوانی
عجب خواب درپیش ہے پھر تو سب کو		سنا لو تب اب اپنی اپنی کہانی

۲- دردمند

دردمند تخلص، فقیر صاحب نام۔ دکن ان کے بزرگوں کا وطن ہے، بلکہ ان کا بھی مولد دکن ہے، لیکن تربیت انہوں نے شاہ جہان آباد میں پائی ہے، اور خدمت سے میرزا جان جاناں مظہر کی کیفیت آدابِ فقر کی اُٹھائی ہے۔ مرید بھی مرزائے مذکور کے تھے۔ چند مدت عظیم آباد میں بود و باش کی ہے، اور رفاقت میں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کے بیٹے کی گذرانِ معاش کی ہے۔ بعد اس کے پھر دلّی گئے، اور چند مدت وہاں رہے پھر نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ بھتیجے نواب وردی خاں مہابت جنگ کے بُلائے ہوئے شاہ جہان آباد سے مرشد آباد میں آئے، اور طور بود و باش کے وہیں ٹھہرائے۔ رفاقت میں نواب مذکور کی البتہ ایک رفاہِ احوال ہوا۔ آخر ۱۱۷۶ھ گیارہ سو چھہتر ہجری میں بلدۂ مرشد آباد کے اندر انتقال ہوا۔ سلیقۂ سخن رسی میں اُستاد تھے، اور طریقۂ مصاحبت و اختلاط کے ماہر حد سے زیاد تھے۔ فارسی دیوان ان کا صاحب نظروں کا منظور ہے، اور ہندی میں تو یہی ساقی نامہ مشہور ہے +

پڑی اُس کی خوبی کی ازبسکہ دھوم	لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم
ارے ساقی! اے جانِ فصلِ بہار!	یہی تھا ہمارا و تیرا اقرار
ہمارے بِسرنے کی یہ فصل تھی؟	فراموش کرنے کی یہ فصل تھی؟

۵ اس مضمون کو شیخ ابراہیم ذوق نے اس طرح باندھا ہے ؎ کہے ہے اس سے دم ذبح یہ گلو میرا + کی بوجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا۔ لیکن درد کی بندش کو نہیں پہنچتا ۱۲

تری جان کی سوں غنیمت ہوں میں — سلیقوں میں ظالم قیامت ہوں میں
مری عقل میں کون انباز ہے — ارسطو مرا اک دوا ساز ہے
فلک چرخ مارے گا گر صد ہزار — نہ لاوے گا مجھ سا کوئی روبکار
نظر تو کرو ٹک چمن کی طرف — شگوفہ کو آیا ہے مستی سے کف
چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک — کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک
تجھے جان گل کے لہو کی قسم — تجھے باغ کے رنگ و بو کی قسم
تجھے جام کے چشم تر کی قسم — تجھے اپنی پنہاں نظر کی قسم
ادا سے لہکنے کی تجھ کو قسم — نشہ سے بہکنے کی تجھ کو قسم
تجھے جام صہبا کے سر کی قسم — تجھے اپنے مینا کے سر کی قسم
تجھے نازِ مستی کی اپنے قسم — تجھے خود پرستی کی اپنے قسم
قسم ہو تجھے بے سبب جنگ کی — قسم ہو مرے نام کے ننگ کی
ارے بے وفا بے مروّت صنم — میں دیتا ہوں تجھ کو قسم پر قسم
تجھے دختر رز کی حرمت کی سوں — تجھے مغبچوں کی شرافت کی سوں
تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں — تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں
تجھے ناتوانوں کی طاقت کی سوں — تجھے بیقراروں کی فرصت کی سوں
شبِ عید کے تجھ کو چاؤں کی سوں — تجھے اپنی مہندی کے پاؤں کی سوں
جو تونے کیا مے کو مجھ پر حرام — تو اتنا کر اے ظالموں کے امام
کہ تو سرکشی سے نہ کر پائمال — مرے خون کو اپنے اوپر حلال
تجھے رحم مجھ پر کچھ آتا نہیں — مگر جیونا میرا بھاتا نہیں
نہ توڑ آئینہ اپنے خریدار کا — زباں خوب نیں اپنی سرکار کا
یقیں جانیو گر نہ ہو ایک آن — تری مہربانی کا مجھ کو گمان

تو صورت نہ پکڑے ہماری حیات — نکل جائے جی ناامیدی کے ساتھ

رباعی

ہے غم سے رقیبوں کے مرا دل ناشاد — اس دھڑکے سے جاتے ہیں سبھی عیش بباد
پرویز کے شیشہ خانہ عشرت پر — سنگ آیا ولیک سخت آیا فرہاد

۳- دل

دل تخلص ہے شیخ محمد عابد نام ۔ متوطن بلدہ عظیم آباد کے بے مثل ، اور بے نظیر عالم محبت و وداد کے شیخ محمد روشن جوشش تخلص بڑے بھائی ہیں ، جن کی خوبیاں باب الجیم کے اندر بیان میں آئی ہیں ۔ غرض دونوں بھائی سنجیدہ اطوار اور حمیدہ خصال ہیں ، طریقہ یک رنگی میں بے مثال ہیں یہ ابیات دل خراش اُس اہل دل کی تلاش سے ہیں[۱] +

تیری زلفوں میں پھنسا دل یہی تقصیر ہوئی — نقد جاں لیجئے حاضر ہے گنہگاری دل
نالے ہی سدا بھر بھر دن عمر کے بھرتے ہیں — ہیں نزع میں ہم تجھ بن جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ — رہتا ہے مدام آب دیدہ
تمہارے در پہ جو دربان نے آستیں پکڑی — برنگ نقش قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

۴- دیوانہ

دیوانہ تخلص ، رائے سرب سکھ نام ، رشتہ دار راجہ مہانراین کا تھا ۔ نہایت پرگو ۔ اور وضع مغلیت پر مرتا تھا ۔ دو دیوان زبان فارسی میں اس نے لکھے ہیں ، اور اکثر ریختہ گو لکھنؤ کے ، مرزا جعفر علی حسرت ، اور میر حیدر علی حیراں ، اس کے شاگردوں میں سے ہیں سنہ ۱۲۰۰ھ بارہ سو

[۱] اصل کتاب میں نمونہ کلام نہیں تھا معلوم نہیں مصنف نے کیوں نہیں ملایا جس نسخہ سے ہم نے نقل کیا ہے اُس کے کاتب نے چھوڑ دیا ہے یہ مندرجہ بالا چہار شعر ہم نے ، سخن شعرا ، مصنفہ عبدالغفور خاں نساخ سے نقل کئے ہیں +

چار ہجری میں لاچار گرم روی راہِ عدم میں کی، اور آتشِ فنا پیکرِ وجود کو دی[1]۔ فارسی منظوم اس کا دس ہزار بیت سے زیادہ ہے۔ یہ ہندی اس کا طبعزاد ہے ◆

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر — گفتگو ہم سے اُسے پر نہیں انکار بغیر
بزم میں رات بہت سادہ و پرفن تھے ولے — گرمیِ بزم کہاں اُس بت عیار بغیر
دیکھ بیمار کو تب سے یہ طبیبوں نے کہا — ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر
جان پر آبنی ہمدم مری خاموشی سے — بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر
جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے — کیونکہ دیوانہ بھلا رہیئے اب اُس یار بغیر

ولہ
دل ہے کہ تیری تیغ کے آگے سے ٹل نہ جائے — رستم کا کیا جگر ہے جو زہرا اچھل نہ جائے

رباعی
وے یار کہاں کہ یار باشی کیجے — وے وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے
اک گوشہ میں بیٹھ کر دیوانہ تنہا — اب ناخنِ غم سے دل خراشی کیجے

بابُ السّین

۱۔ سَودا

نامِ نامی اور اسمِ گرامی اُس شاہ بازِ عرش پرواز معنی کا مرزا رفیع ہے۔ متوطن دار الخلافہ شاہجہان آباد کے۔ بیشک مقام اُن کی طبیعتِ فلک فرسا کا موافق اُن کے نام کے نہایت رفیع اور منیع ہے۔ روزِ تولد سے ساٹھ برس کی عمر تک دلّی میں ساتھ کمال عز و وقار کے رہے، اور طبع رسا کی مربی گری سے انیس و جلیس سلاطینِ نامدار اور وزرائے عالی تبار کے رہے۔ اگرچہ

[1] مصنف نے جس خاص استعاروں میں راے سرب سنگھ دیوانہ کو انتقال کو بیان کیا ہے، اُن میں ایک خاص جھلک پائی جاتی ہے، جو مصنف کی فراخدلی پر مشعر ہیں ◆

ذات اُس یگانۂ روزگار کی کثرتِ اشتہار کے باعث مستغنی ہے تکلیف سے خامۂ مدائح نگار کی، لیکن انصاف کہتا ہے کہ کچھ تھوڑا سا احوال اس مستغنی الصفات کا لکھا چاہیئے، اور تذکرے سے اُس شاہ بیتِ کلیاتِ معانی کے، بیان کو ان اوراقِ پریشان کے، زیب وزینت دیا چاہیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرزائے مذکور سرحلقۂ سخنوران اور سرآمدِ معنی گستران تھے۔ آشنائے معنی بیگانہ اور مضمون تازہ کے پیدا کرنے میں یگانہ تھے۔ اقسامِ نظم سے دیوان اس مطلع دیوان سحربیان کا بھرا ہے، اور انواعِ نظم کو کیا کیا زور وشور کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خصوصاً طرزِ قصیدہ کو کس صفائی اور تکلف سے ادا کر کے اس طاقِ بلند پر رکھا کہ دستِ وہمِ نازک خیالانِ ہندستان کا اس کے خیال تک نہ جا سکا۔ آگ کو یاد میں اُس آتش زبان کے ہجومِ شرار سے جوشِ قطراتِ عرقِ انفعال ہے، اور پانی کو خجالت سے اس طبعِ روان کی خاک میں چھپنے کا خیال۔ زبانِ ہندی شرفِ ہمزبانی سے اُس کی سرفراز، اور نظم ریختہ کو طبعِ معنی آفرین پر اُس کے گھمنڈ اور ناز۔ جب کہ بعد خراب اور ویران ہونے شاہ جہان آباد کے نقل وحرکت کا اتفاق میرزائے مذکور کو اس شہر سے ہوا، تو اَور شہروں کی سیر کرتے ہوئے آخر بلدۂ لکھنؤ میں طورِ سکونت کا کیا۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت قدر ومنزلت کی، اور چھ ہزار روپے سالیانہ کی جاگیر مقرر کر دی۔ چنانچہ بیشتر قصیدے نواب آصف الدولہ مرحوم کی تعریف میں کہے ہیں، اور کیا کیا تر وتازگی کے ساتھ مضامینِ عالی باندھے ہیں۔ جب کہ سنِ شریف اس خضرِ راہِ سخن دانی کا ستر برس کو پہنچا، تو داعیِ اجل کو لبیکِ اجابت کہہ کے سرائے وجود سے پیما منزلِ عدم کا ہوا۔ تاریخ وفات اُس رفیع قدر محفل نکتہ دانی کی ہر ایک سخن سنج نے کہی ہے، لیکن یہ تاریخ اُس فرہادِ بے ستونِ مضمون تراشی کے سنگ مزار پر کندہ کی ہوئی ہے *

فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا		خلد کو جب حضرتِ سودا گئے	
شاعران ہند کا سرور گیا		بولے منصف دور کر رائے عناد	

۱۱۹۵ھ

آغا باقر کا امام باڑہ اُس محبِ امام علیہ السّلام کا مدفن ہے، سایۂ قدومِ امام کے باعث

بیشک رنجِ مکافات کے واسطے مامن ہے - یہ اشعار یادگار جریدۂ روزگار کے لکھے جاتے ہیں، اور یہ اوراق پریشان اس سے زینت پاتے ہیں +

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی — نہ ٹوٹے شیخ سے زنّار تسبیحِ سلیمانی

ہنر پیدا کر اوّل، ترک کیجو تب لباس اپنا — کہ ہو جو تیغ بے جوہر اُسے ہے ننگِ عریانی

خوش آمد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کی — نہ جھاڑے آستینِ کہکشاں شاہوں کی پیشانی

کرے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی — ہوئی جب تیغ زنگ آلود کب جاتی ہے پہچانی

یہ روشن ہے برنگِ شمع ربطِ باد و آتش سے — موافق گر نہ ہووے دوست، ہے وہ دشمن جانی

ولہ

ہے پرورش سخن کی مجھے اپنی جاں تلک — جوں شمع زندگانی مری ہے زباں تلک

بے ماتم اس چمن میں نہیں خندۂ طرب — ہے کسوتِ کبود گلِ زعفراں تلک

لاف سپہ گری نہ بکے مردِ راست باز — پاوے نہ راہِ حرف زبانِ سناں تلک

سختی سے گذری اہل سعادت کی یہاں معاش — ہے منحصر غذائے ہما استخواں تلک

مطلع ثانی

جس کی بہار پہنچی نہ آخر خزاں تلک — آیا نہ ایک گل کبھی اس بوستاں تلک

وہ مرغِ ناتواں ہوں کہ صحنِ چمن سے میں — بے نردبان پہنچ نہ سکوں آشیاں تلک

روضہ میں جن کے حلقۂ چشمِ ملک سوا — پہنچا نہ پائے شمع کبھو شمعداں تلک

ہنگام طوف بسکہ ملائک ہمیشہ وہاں — لیتے ہیں خاک آن کے اُس آستاں تلک

خادم کہے ہیں وہاں کے یہ آپس میں دیکھ کر — پہنچے ہے کوئی دن کو زمیں آسماں تلک

رہنے کو جگ میں صورت افسوس کے تئیں — احکام خورمی نے کیا منع یہاں تلک

انگشت چوسنے کے لئے طفلِ شیر خوار — ممکن نہیں کہ لا سکے اپنے دہاں تلک

اس چرخِ دوں پرست تلے بہرِ مشتِ جَو — مانند آسیا کے پھروں میں کہاں تلک

قصیدہ

ہے سخن سنج اِک جوانِ متیں
فخرِ صائب جو وہ کرے تحسیں

رات جا کر میں اُس کی خدمت میں
اُسے دیکھا تو تھا نپٹ غمگیں

میں جو پوچھا؟ کہا سبب مت پوچھ
خبث کرنا کسی کا خوب نہیں

لیکن اے یار تجھ سے کہتا ہوں
ل سکے گو مجھ پہ سب کریں نفریں

داغ ہوں اُن سے اب زمانے میں
بزمِ شعرا سے ہیں جو صدر نشیں

یعنی سودا و میر و قائم و درد
لے ہدایت سے تا کلیم و یقیں

کیا غرور و دماغ و کیا نخوت
کون سا کبر ہے جو اُن میں نہیں

مثلِ شیرازۂ کتاب اللہ
سمجھے ہر ایک اپنی چینِ جبیں

ننگ جانیں جو بزم کا اُن کی
بو علی ہو صفِ نعال نشیں

اور جو احمق اُن کے سامع ہیں
دم بہ دم اُن کی کیا کریں تحسیں

جیسے سُبحانَ مَنْ یَرانی پر
لڑکے مکتب کے کہتے ہیں آمین

شعر و تقطیع اُن کے دیواں کی
جمع ہووے تو جیسے نقشِ نگیں

اُس میں جو دیکھئے تو آخر کار
یا توارد ہوا ہے یا تضمیں

اتنی کچھ شاعری پہ کرتے ہیں
پیچ در کونِ آسمان و زمیں

غرض اس خبث سے تئیں سن کر
ہو گئے بے اختیار میں و وہیں

کہا سودا کو اُن بزرگوں میں
مت گنو اُس کا ہی یہ کب آئیں

اور جو ہووے بھی تو لائق ہے
فخر کرنا چاہیے ہے اُسکے تئیں

ہے وہ مداح ایک ایسے کا
مسند جاہ جس کی عرش بریں

یعنی نواب سیف دولہ سدا
جس کی شمشیر و فرقِ دشمن زیں

رفعتِ دستِ جود سے جس کے
پنجۂ آفتاب کی سی طرح
غنچہ کی بھی گرہ میں بند کیا
دست و پا اپنے گم کرے ہی عدو
پوچھتا ہے ہر ایک سے سچ کہہ
فکر میں قہر کے ترے ہر شب
نیند اُس کو نہ آوے تا نہ پڑھیں

دامنِ خلق کا ہے یہ آئیں
بہرہ ور ہے ہمیشہ روئے زمیں
تیری بخشش نے مشتِ زر کی تئیں
یاد کر تیری تیغ و خنجرِ کیں
سر مرا شنگرفیوں میں ہی کہ نہیں
حالتِ نزع سے زبس ہی قریں
جاے افسانہ سورۂ یٰسیں

احکام پر ترے نہ کرے کیونکہ کام تیر
اُتنا ہی چُست بیٹھے ہے جتنی کماں ہو چُست
ہمسر ہے کس کا تیر ترے تیر سے کہ یہ

ہے یہ کمان حلقہ بگوش و غلام تیر
خوبی کا حق کرے ہے ادا یہاں تمام تیر
انگشت ہے قضا کی کہیں ہیں بنام تیر

شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جوان ہے
کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے میں کئی شکل
گھوڑا ہے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
ثابت ہے، جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ جان
کہتا ہے نفر غزہ کو صراف سے جا کر
یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ
اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے
لیتے ہیں بایں روسیہی وہ تو دو ماہہ
قاضی کی جو مسجد ہی کہ عابا ندہ کے اُس میں

دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زبان ہے
ہے وجہِ معاش اپنی سو جس کا یہ بیان ہے
تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ مکان ہے
تیروں میں ہی پر گیری تو بے چلہ کماں ہے
بی بی نے تو کھایا ہے یہ فاقہ سی میاں ہے
شوال بھی پھر ماہِ مبارک رمضاں ہے
تنخواہ کے پھر ملنے کی یہ شکل کہاں ہے
ٹک دھوس دھڑکے کی جنہیں تاب و تواں ہے
بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جواں ہے

مُلّا جو اذاں دیوے تو منہ موند کر اُس کا
بولا جو خطیب اس میں تو مارے اُسی اک ڈھول
رینگے ہی گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے
اور وہ جو ہیں کمزور سو وہاں آن کے بیٹھو
اُٹھ اُٹھ کے دکھاتے ہیں اُنہیں حال وہ اپنا
یوں بھی نہ ملا کچھ تو ہر اک پال کے آگے
کوئی سر پہ کئے خاک گریباں کسی کا چاک
ہندو و مسلماں کو پھر اُس پال کے اوپر
یہ مسخرگی دیکھ کے وہ صاحب ارتھی
گو ہو جئے جا کر کسی عمدے کے صاحب
وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں وہ زانو
خمیازہ پہ خمیازہ ہی اور حیرت اوپر حیرت
صیغہ پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر
صحبت ہے یہ اُس سے اگر آقا کی تئیں چھینک
دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اُس کے
سوداگری کیجے تو ہے اُس میں یہ مشقت
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
گر خان و خوانین کی کرے کوئی وکالت
ہر گھر میں وہ چاہے کہ میں قوّالہ سا چھوٹوں
شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانا

کہتے ہیں کہ خاموش مسلمانی کہاں ہے
ہاتھ آگیا واعظ تو تھپیڑا بہ دہاں ہے
نہ ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذاں ہے
رستے کے جو آگے کو یہ ہر ایک دُکاں ہے
دربار رَوا اس عہد میں جو خورد و کلاں ہے
اس سبح سے رسالہ کا رسالہ ہی رواں ہے
کوئی رو دئے ہی مُنہ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے
ارتھی کا تو ہم سے ہے جنازے کا گماں ہے
کرتا ہی جو وہاں عرض تو نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے
اُس کی تو اذیت بڑی ہی آفتِ جاں ہے
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خوابِ گراں ہے
مُنہ صورتِ سوفار کمر شکلِ کماں ہے
سو دو سو روپے کا جو کسی عمدہ کے ہاں ہے
آوے تو وہ اُس کو بہ خشونت نگراں ہے
ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اس وقت گماں ہے
دکھن میں بکے وہ جو خریدِ صفہاں ہے
سمجھے ہے فروشندہ پہ دزدی کا گماں ہے
اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ ہی کو عیاں ہے
ہر کوچہ میں جوں آب چکاں اور رواں ہے
دیکھے جو کوئی فکر و تردد تو یہاں ہے
زینت قطعۂ تہنیتِ خان زماں ہے

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر — گر رحم میں بیگم کے سنے نطفۂ خاں ہے
اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ اس کا — پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے
ملائی اگر کیجے تو ملا کی ہے یہ قدر — ہوں دو روپے اس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے
دن کو تو وہ بیچارہ پڑھایا کرے لڑکے — سب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے
تس پر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اس کے — لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے
چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت — چھٹتے ہی تو شعرا کے وہ مطعون زباں ہے
دیتا ہے دم خرس سی کوئی شملہ کو نسبت — گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے
پوچھے ہے مریدوں سے یہ جب صبح کو اٹھ کر — ہے آج کدھر عرس کی شب ورد کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس تو کر ڈاڑھی کو کنگھی — لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے

در ہجو اسپ نحیل

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار — رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار
جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے — ہر گز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے — موچی سے کفش پا کو گنٹھاتے ہیں وہ ادھار
تنہا وہ لے نہ دہر سے عالم خراب ہے — خست لیے اکثروں میں اٹھایا ہے ننگ و عار
ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں — پاوے سزا جو ان کا کوئی نام لے نہار
نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے — گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو ایسا خراب و خوار
نے دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نے سئیس — رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار
مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا — ہر گز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
ناطاقتی سے اس کی کہاں تک بیاں کروں — فاقوں کا اس کے ہائے کہاں تک کروں شمار
اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال — کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
جس دن سی اُس قصائی کے کھونٹی بندھا ہی وہ
ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
خط شعاع کو سمجھے ہے وہ دستہ گیاہ
تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھانس کا
دیکھے ہی جب وہ توبرہ ٹھاں کی طرف
فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
بے استخواں نہ گوشت نہ کچھ اُس کے پیٹ میں
پیدا ہوئی ہی تس پہ اگن پاؤ اس قدر
گذرے وہ جس طرف سے کبھو اُس طرف ستی
سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہی یا سُرنگ
ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
یہ حال اُس کا دیکھ غرض یوں کہی ہی خلق
یا مر رہے یا چور لے جاوی یا ہووے گم
تنہا نہ اُس کے غم سی ہی دل تنگ تنگ زیں
القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
رہتے تھے گھر کے پاس تمھارا وہ آشنا
خدمت میں اُن کے میں لیے گیا جا کی التماس
فرمایا تب اُنھوں نے کہ اے میری جان من
لیکن کسی کی چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
صورت کا جس کی دیکھنا ہیگا گدھے کو ننگ
اُمیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار
گذری ہی اس نمط اُسے ہر لیل و ہر نہار
دیکھے ہی آسماں کی طرف ہو کے بے قرار
ہر دم زمیں پہ آپ کو پٹکے ہے بار بار
چوکے کو آنکھیں موند کے دیتا ہی وہ پسار
کھاتا ہے دانہ گھاس کی جاگہ سدا بچار
گھوڑے کو دیکھتا ہی تو یادی ہے بار بار
دھونکے ہی اپنی دُم کو کہ جوں کھال کو لہار
ہرگز دروغ اس کو نہ مت جان زینہار
باد سموم ہووے صبا گر کرے گذار
خارشت سے زبسکہ ہی مجروح بے شمار
کہتے ہیں اُس کے رنگ کو کسی اس اعتبار
چنگل سی موذی کی تو چھڑا اُس کو کردگار
اس تین بات سی کوئی بھی ہووی آشکار
خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہی فگار
آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار
مشہور تھا جنھوں کنے اک اسپ نابکار
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم اوپر نثار
یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو گے انکسار
سیرت سے جس کی ننگ ہی سگ خشمگیں کو عار

بد رنگ جیسے لید ہی بد رنگ جوں پشاب
بد ہیئت اس قدر کہ کرے اصطبل اجاڑ

مانند میخ چوکی لکڑ زن سے ہے نہاں پر
لاجنب وے لے جگہ نہیں جوں میخ استوار

حشری ہی اس قدر کہ قیامت کو اس اوپر
دجال منہ کو اپنے سیہ کرکے ہو سوار

اتنا ہی سرنگوں ہی کہ سب اڑ گئی ہیں دانت
جبڑے پہ بسکہ ٹھوکروں کی نت پڑی ہی مار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلادے اُس کا سن
پہلے وہ لے کے ریگِ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اُسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

کم رو ہے اس قدر کہ اگر اُس کی نعل کا
لوہا منگا کے تیغ بنا دے کبھی لُہار

ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کارزار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دست غیر کے نہیں چلتا وہ زینہار

مٹھا نو اس قدر ہے کہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں میں یار

دلی میں آن پہنچے تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آ کر ہے وقتِ کار

مدت سے کوڑیوں کو اُڑاتے ہو گھر میں بیٹھ
ہو کر سوار اب کرو میداں میں کارزار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اُس پہ زین
ہتیار باندھ کر میں ہوا اُس اُوپر سوار

جس شکل سے سوار تھا اُس دن میں اس اُوپر
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھی دونوں ہاتھوں میں پکڑی تھا منہ میں باگ
ٹخ ٹخ کے پاشنوں سے مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے توبرا اُسے دکھلائے تھا نفر
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا رو براہ
ہلتا نہ تھا جگہ ستی جوں میخ استوار

اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبر اُن میں سے کہتے تھے یوں پکار

پیچھے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھ پہ نکلے دو ختیار

کہتا تھا کوئی ہے بزِ کوہی نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ہیگا ولایت کا یہ حمار

پوچھے تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ کیا کیوں تجھے سوار

کہنے لگا یہ آ کے اُس اجماع میں ایک شخص
گھوڑا نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہ گار

بھولا ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈائن چلے ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار

اس مخمصے میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک اور
فتنے کو آسماں نے کیا بھیجے وہاں دو چار

دھوبی کمار کی گدھی اُس دن ہوئی تھی گم
اس ماجرے کو سن لیا دونوں نے جو وہاں گذار

ہر اک نے اُس کو اپنی گدھی کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمار

دریائے کشمکش ہوا اُس آن موج زن
تھا عنقریب ڈوبنے خفت سے یک کنار

بدرشی اُس کی دیکھ کے کر خرس کا خیال
لڑکے بھی وہاں تھے جمع تماشے کو بیشمار

کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چڑھا
دوں گا ٹکا میں تجھ کو بھی تو چندہ ایتوار

رکھتا کوئی تھا لا کے سپاری کو منہ کی بیچ
لیتا تھا کوئی دوڑ کے ہو تن ستی اُتار

کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اُس کے گرد و پیش
ساتھ اُس سمند خرس نما کے ہو چشم چار

جھگڑوں میں دھوبیوں سے کہ لڑکوں کو دوں جواب
کتوں کو ماروں یا کہ مروں اپنا پیٹ مار

پہلی ہی گولی چھوٹتے اُس گھوڑی کو لگی
ایسا لگے نہ تیر کہ ہووے نہ تن سے پار

بارے دعا مری ہوئی اُس وقت مستجاب
وہاں سے بھر نمط کیا جنگگاہ تک گذار

یہ کہ کے حق ستی میں ہوا مستعد بہ جنگ
اتنے میں مرہٹہ نے ہو انجھ سے بھی دو چار

گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقت کارزار

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اُس کو حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار

جب میں نے دیکھا جنگ کی یہاں تو بندھی گل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

مقدور نہیں اُس کی تجلی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردے کو تعین کے در دل سے اُٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمع حرم رنگ جھلکتا ہے بتاں کا

اس گلشن ہستی کی عجب دید ہے لیکن		جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا
سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو		مضمون یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا
جگہ تھی دل کو ترے دل میں اک زمانہ تھا	وله	مرے بھی شیشہ کو اس سنگ میں ٹھکانا تھا
جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤں گا	وله	ہاتھ سے دل کے ترے اب میں نکل جاؤں گا
لطف اے اشک کہ جوں شمع گلا جاتا ہوں		رحم اے آہ شرربار کہ جل جاؤں گا
چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہت گل		پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

۲- سوز

سوز تخلص ہے، سید میر نام، ساکن قراول پورہ شاہ جہان آباد۔ سید عالی نسب، اور فن سخنوری میں اُستاد، طرز ادا بندی کے بادشاہ، اور صورتِ مضمون درد و آہ تھے۔ کلام ان کا سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے، اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز۔ شعر کے پڑھنے میں صاحب طرز خاص تھے، اور آئین محبت میں مایۂ موّدت و اخلاص۔ علم تیر اندازی اور کماں داری میں بہ شدت دل آشنا رکھتے تھے، اور حُسن شفیعہ نویسی میں نہایت دستِ رسا۔ ابتدائے جوانی میں انہوں نے ساتھ کامِ دل کے ایّامِ زندگانی کو صرفِ نشۂ بے خمار کیا، اور سنہ اٹھارھویں میں جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے وارستہ مزاجی کی تکلیف سے لباسِ فقر اختیار کیا۔ لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے، اور اوقات ساتھ توکل و قناعت کے بسر کرتے تھے +

سنہ ۱۲۱۲ بارہ سو بارہ ہجری میں مرشد آباد تک تشریف لائے، لیکن اطوار سکونت کے وہاں کچھ نظر نہ آئے۔ اُسی سال پھر لکھنؤ تشریف لے گئے، اور اس دارِ فنا سے راہی ملک بقا کے ہوئے +

علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ "جس سال یہ تذکرہ میں لکھتا ہوں، تو میر مذکور نے کچھ اشعار اپنے مع چند فقرۂ نثر لکھ کر مجھے بھجوائے تاکہ داخل تذکرہ کروں۔" چنانچہ ایک

آدہ فقرہ میر مذکور کی نثر کا بھی خانِ مذکور نے تذکرے میں لکھا ہے۔ ترجمہ اُس کا زبانِ ریختہ میں راقم حقیر نے اس طرح کیا ہے "کہ جو شئے حق سبحانہ تعالیٰ نے خلق کیا ہے، بلکہ جتنے خار و خس ہیں، کتنے ہی کام آتے ہیں، اور بندگانِ خدا اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مگر یہ سوز وہ شخص ہے کہ کسی کو اس سے حلاوت حاصل نہیں ہوتی ہے، سواء سکوت اور کراہیت کے۔ سبحان اللہ! یہ بھی قدرتِ الٰہی کا اظہارِ کمال ہے، کہ ایسی شئے خلق کی جاوے۔ جس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھاوے۔ پس اگر کوئی منکر سوال کرے کہ ناکارہ محض تو نہیں ہے؟ خیر تو اس لائق ہے کہ نام اُس کا قابل جلانے کے ہے"۔ غرض میر مذکور صاحب دیوان ہیں۔ اشعار منتخب ان کے لکھے جاتے یہاں ہیں۔

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یارب! رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

درد سے محروم ہوں درماں سے مجھ کو کام کیا
یارِ خاطر تھا سو میرا بار شاطر ہو گیا

میں نے جانا تھا صحیفہ عشق کا ہے میرے نام
واہ یہ دیوان بھی نقلِ دفاتر ہو گیا

کیا مسیحائی ہے تیرے لعل لب میں اے صنم
بات کے کہتے ہی دیکھو سوز شاعر ہو گیا

وله

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں دُکھ جائیگا
ہاں بغیر از قطرۂ خوں اور تو کیا پائے گا

قتل کی نیت تو کر آیا ہے تو کیا دیر ہے
پر مجھے تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا

پھر بھی کہتا ہوں تجھے "آ سوز کو یوں مت ستا"
مت ستا ظالم! کہیں تو بھی ستایا جائیگا

وله

مُندی گر چشمِ ظاہر دیدۂ بیدار ہو پیدا
در و دیوار سے شکلِ جمالِ یار ہو پیدا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار ہو پیدا

یہاں تک کفر پورا چاہیئے گر خاک گلشن ہو
بجائے ہر رگِ گل رشتۂ زنار ہو پیدا

قتیلِ خنجرِ مژگاں ہوں، کیا یہ بھی تعجب ہے،
کہ میری خاک سے سبزے کی جاگہ خار ہو پیدا

مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سوز کو ڈر ہے
جو لاکھوں بار ہووے قتل لاکھوں بار ہو پیدا

وله

جی ناک میں آیا بُتِ گلفام نہ آیا
جینا تو الٰہی مرے کچھ کام نہ آیا

دنیا میں بھی دوستی ہوتی ہے مری جان
جبتک نہ لیا دل تجھے آرام نہ آیا

عالم کی تمنا میں تری جاں لب آیا — رحمت سے خدا کی تو لب بام نہ آیا
قاصد سے تو پوچھا تھا کہ قاصد ہی تو کس کا — وحشت سے اُسے یاد مرا نام نہ آیا
تھا نزع کی حالت میں یہی سوز کی لب پے — جی ناک میں آیا، بُت گل فام نہ آیا
کھڑے رہیو والو مگر سوز ہے یہ — وله — بھلا اس کے دل کا تو ارمان نکلا
مرا کشتہ ایسا تو ہے جس کی خاطر — یہ خورشید پھاڑے گریباں نکلا

قتل سے یہ بے گنہ راضی ہیں اپنے اس لئے — وله — ہاتھ میں اک روز تو داماں قاتل ہوے گا
ابر کے قطرہ سے ہو جاتے ہیں موتی ناصحا — کیا ہمیں رونے سے اپنے کچھ نہ حاصل ہوے گا
درگذر اس خوں سے آخر پھر تجھے آویگا رحم — سوز کا دل جس گھڑی خنجر سے بسمل ہوے گا
کعبہ ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا — وله — جو تم سے بتاں ہوگا سو اللہ کرے گا
زلفوں سے پڑا طول ہیں اب عشق کا جھگڑا — خط آن کے یہ مجملہ کوتاہ کرے گا

اپنے رونے سے گر اثر ہوتا — وله — قطرۂ اشک بھی گہر ہوتا
جن کے نامے پہنچتے ہیں تجھ تک — کاش میں اُن کا نامہ بر ہوتا
پھر نہ کرتا ستم کسی پہ اگر — حال میرے سے باخبر ہوتا
خونِ عشاق کرتے کیوں ناحق — گر بتوں کو خدا کا ڈر ہوتا
سوز کو شوق کعبہ جانے کا — ہے بہت پر زیادہ تر ہوتا

اگر میں جانتا ہے عشق میں دھڑکا جدائی کا — وله — تو محشر تک نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا
نہ پہنچے آہ و نالہ گوش تک اُس کے کبھو اپنا — بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنے نارسائی کا
خدایا کس کے ہم بندے کہاویں سخت مشکل ہے — رکھے ہے ہر صنم اس دہر میں دعویٰ خدائی کا
خدا کی بندگی کا سوز ہے دعویٰ تو خلقت کو — ولے دیکھا جسے بندہ ہے اپنی خود نمائی کا

قاضی ہزار طرح کے قصوں میں آ سکا — وله — لیکن نہ حسن و عشق کا جھگڑا چکا سکا
قاصد ہو طفل اشک گئے بار ہا ولے — دل کی خبر کوئی نہ تری کو سے لا سکا

کیا فائدہ ہی رونے سے اے چشم زار بس — کب اشک دل کی آگ لگی کو بجھا سکا
رستم نے گو پہاڑ اُٹھایا تو کیا ہوا — اُس کو سراہیئے جو ترا ناز اُٹھا سکا
اے سوز عزم کوچۂ قاتل نہ کر عبث — تو ایک بھی بتاوے کہ واں جا کے آ سکا

ولہ

خطرہ نہیں ہی مجھ کو اے عشق اپنے جی کا — تو نے خطاب بخشا جب سے بہادری کا
ہر صبح مُنہ چڑھے ہی اُس تندخو کے اُٹھ کر — کیا آہنی کلیجہ دیکھو ہے آرسی کا
کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سے تو باز آ — دیکھا مزا نہ تو نے ناداں عاشقی کا
عارض کو تیرے پہنچے کب اُس کی ڈھڈھاہٹ — پیارے ہزار ہو تو ہے گل کا رنگ پھیکا
رستم تو آج تو ہے میدان کے سخن کا — اے سوز کس کو دعوی ہی تجھ سے ہمسری کا

ولہ

تجھ پہ قربان مری جان دل و دیں میرا — ایک باری تو سُن افسانۂ رنگیں میرا
بوئے گل شاخ ہوا میں سے بھی لیتا ہی چھین — کس قدر شوخ ہے اللہ یہ گلچیں میرا

ولہ

زلفوں کا اگر مجھ کو سروکار نہ ہوتا — یہاں تک تو پریشان یہ دلِ زار نہ ہوتا
خوگر جو بداوے سے طبیب اپنے کو پایا — تو زیست سے مایوس یہ بیمار نہ ہوتا
گر آنکھ اٹکتی نہ کسی شوخ سے جا کر — تو دل بھی کہیں سوز گرفتار نہ ہوتا

ولہ

ایک دن اک شخص نے اُس سے کہا — تو نے تو یہ ذکر سُنا ہوئے گا
یعنی کہ عاشق ہے ترا جی سے سوز — ہو مُتبسم یہ کہا ہوئے گا

ولہ

بلبل نے جس کا جلوہ جا کر چمن میں دیکھا — دو آنکھ موند ہم نے وہ من ہی من میں دیکھا
خورشید آوے جیسے ابر تنک کے اندر — عاشق کو تیرے جن نے یوں پیرہن میں دیکھا
یوں دیکھنے سے میرے کیا فائدہ کسی کو — دیکھا اُنہیں نے مجھ کو جن نے سخن میں دیکھا

ولہ

اس سوا کھوج نہ پایا ترے دیوانے کا — قطرۂ خوں ہے مگر خار بیاباں میں لگا

ولہ

کسی طرح ترے دل سے حجاب نکلے گا — مرے سوال کا منہ سے جواب نکلے گا
نکلنے کا نہیں سینے سے دل جو ڈھونڈی گا — جو نکلے گا تو جلا سا کباب نکلے گا

ولہ

ہے جیتے جی تو مجھے گوشۂ یار میں رونا
رہے گا مرگ کے بعد از مزار میں رونا

جو چھپ گئے رات کو شبنم چمن میں روئے تو کیا
مجھے تو ایک سے ملے تا ہزار میں رونا

نہ غم خزاں کا مجھے نے بہار کی شادی
خزاں میں خاک ہے سر پر بہار میں رونا

تو روز وصل تو اے سوز اپنے آنسو پونچھ
ابھی بہت ہے تجھے ہجر یار میں رونا

ولہ

بتوں کے عشق سے واللہ کچھ حاصل نہیں ہوتا
اُنہوں سے بات کرنے کو بھی اب تو دل نہیں ہوتا

ولہ

جس نے آدم کے تئیں دم بخشا
اُس نے مجھ کو دلِ پر غم بخشا

ساغر عیش دیا اوروں کو
سوز کو دیدۂ پُر نم بخشا

ولہ

جس نے ہر درد کو درماں بخشا
مجھ سے کافر کو بھی ایماں بخشا

بے نیازی تو میاں کی دیکھو
گل کو بھی چاک گریباں بخشا

چشمِ معشوق کو دی عیاری
سوز کو دیدۂ گریاں بخشا

ولہ

غم تو کہتا ہے کہ میں تجھ کو ستا جاؤں گا
پر مری جان ترے غم کو میں کھا جاؤں گا

ہم غریبوں کے گھر آنے کا کہاں تم کو دماغ
مت کرو وعدہ عبث ہم سے کہ آجاؤں گا

اس طرح جی دوں کہ تو رحم سے بولے صد حیف
رسم عشاق کشی جان اُٹھا جاؤں گا

باغباں فکر نہ کر تو مرے ویرانے کا
آشیاں آتشِ گل سے میں جلا جاؤں گا

لے چکا دل کو خط اب جان جو مانگی ہے خیال
سوز کہتا ہے یہ گولی تو بچا جاؤں گا

ولہ

گل ہی ہنسیں غلام تبسم کی آن کا
غنچہ بھی زر خرید ہے تیرے دہان کا

زاہد جو کھینچ کھینچ کے چلّے ہوا ہے خم
بہتر ہے ایسے چلّوں سے چلّہ کمان کا

سینہ میں دل کہاں ہے غم رفتگاں سے سوز
اخگر یہ رہ گیا ہے نشاں کاروان کا

ولہ

جو دل کہ تھا الٰہی اُس دلربا کے گھر سا
خالی پڑا ہے اب یوں اُجڑا ہوا نگر سا

ترسا نے ترس کھایا احوال سن کے میرا
بے ترس ڈر خدا سے اتنا نہ مجھ کو ترسا

شاید کہ اپنے گھر کی دی اُس نے خاک روبی
خورشید کی کلہ پہ کچھ تو دھرا ہے پرسا

جاتا ہی سوز جس دن کہتا ہی ہمنشیں سے		آئینہ نہ دیکھو اس کو لگتا ہے بدنظر سا
مروت دشمنا غفلت پناہا	وله	ادھر ٹک دیکھ لیجو مرٹکے آہا
صَرَفْتُ العُمرَ فِی لَهْوٍ وَلَعِبِ		فَآهًا ثُمَّ آهًا ثُمَّ آهًا
یوں دیکھ لے ہی وہ کہ ادا کو نہ ہو خبر		چھینے دل اس طرح کہ دغا کو نہ ہو خبر
عشاق ہیں تیری تیغ تلے او ستم پناہ		سر اس طرح سے دیں کہ قضا کو نہ ہو خبر
رخصت جو دی تو مجھ کو تو میں تیرے پاؤں کا		بوسہ لوں اس طرح کہ حنا کو نہ ہو خبر
ناصح تو چاک جیب کا مانع ہی اس قدر		دل چاک یوں کروں کہ قبا کو نہ ہو خبر
اب ضرر کرنے لگا دل کو بتاں کا اختلاط	وله	سچ تو ہے ان بے وفاؤں سی کہاں کا اختلاط
اب کوئی دم کو مچاوے گی خزاں یاں آ کو دھوم		عندلیبو چھوڑ دو تم گلستاں کا اختلاط
یہ سب باتیں ہیں قاصد یار میرے گھر نہیں آتا	وله	نہ دیکھوں جب تلک آنکھوں سی کچھ باور نہیں آتا
پرائے دل کو لے کر اپنے تلووں کے تلے ملنا		ارے سن تو تجھے ہرگز خدا کا ڈر نہیں آتا
کسی کے دل میں ہو گا سوز مر جاوے تو بہتر ہے		الٰہی میں مروں کیوں کر مجھے تو مر نہیں آتا
کیا دید کروں میں اس جہاں کا	وله	وابستہ ہوں چشم خوں چکاں کا
ہرگز نہ ملا تری گلی سے		ممنون ہوں جسم ناتواں کا
سوز آگے ذرا سنبھل کے جانا		بیٹھا ہے لگائے گھات بانکا
جگر سی آہ دل سی نالہ سینہ سے فغاں نکلا	وله	سرے تن سی گیا حسرت زدوں کا کارواں نکلا
جو دل تھا میرے پہلو میں سو اب وہ عرش اعظم ہی		خدا کے واسطے دیکھو کہاں سی جا کہاں نکلا
الٰہی محبت کو لگ جائے لوکا	وله	کہ اٹھتا ہے ہر دم جگر سے بھبوکا
فریب محبت نے مجھ کو پھنسایا		میں بھولا میں بھولا میں چوکا میں چوکا
جہاں روز پریوں کا رہتا اکھاڑا		وہاں اب پڑا ہے گا میدان ہو کا
مرا قتل کیا دل ربا نے نہ چاہا	وله	وہ کب چوکتا تھا خدا نے نہ چاہا

چشم غفلت کھول ٹک دیکھ تو ای مست خواب
دہر نے کن کن ملوکوں کا کیا خانہ خراب

مسند فرعونیت پر بیٹھتے تھے جو یہ باز تو
اہلِ استحقاق کا منہ سے نہ دیتے تھے جواب

خاک میں پنہاں ہوئے ایسے کہ کچھ پیدا نہیں
کون سا ان میں ہے رستم کون سا افراسیاب

بارہ ساعت کے لئے افلاک پر ہیں جو دماغ
واہ واہ اُن کو بھی کہہ لو آفتاب اور ماہتاب

ولہ

پوچھیو تو باندھ کر کس پہ چلا ہے تو کمر
میں پڑا کھاتا رہوں گا تا قیامت پیچ و تاب

ان دنوں میں سوز کو دیکھا ہے یارو واہ وا
ایک دنیا دار سے مل کر بنے عالی جناب

ولہ

اشک کب ہوں ترے مستانے کی خشک
کوچے کب ہوتے ہیں میخانے کے خشک

چوری چوری منہ ترے شاید لگا
ہونٹ کچھ بے ڈھب ہیں پیمانے کی خشک

زلف کی پلٹو میں کیا جا کر پھنسا
یا الٰہی ہاتھ ہوں شانے کے خشک

ولہ

ٹکرائیں سنگ سے سر ہو ہمکنار ہم تم
روئیں گلے سے لگ کر اے آبشار ہم تم

میرا ہی سرو مجھ سے سرکش ہوا ہے قمری
نالے کریں نہ یک جا ہیں سوگوار ہم تم

دیکھیں تو داغ سینہ کس کے ہیں اب زیادہ
اے لالہ داغ دل کے کرلیں شمار ہم تم

تو میری دل کو دیکھ اور میں تیری دل کو دیکھوں
دل چاک چاک کر کر دیکھیں بہار ہم تم

تم تو چلے گئے پر یہ سوز ہے اکیلا
اے میر کے درد صاحب تھے یادگار ہم تم

۳۔ سجّاد

سجّاد تخلص، میر سجّاد نام، اکبر آبادی۔ وطن بزرگوں کا اِنکے آذربایجان ہے، لیکن تربیت انہوں نے شاہ جہان آباد میں پائی ہے۔ اور شاگردوں میں شاہ نجم الدین آبرو کے کیفیت طرز ایہام شاہ صاحب مذکور سے زیادہ ہے سچ تو یہ ہے کہ اپنی وضع کا یہ عزیز بھی اُستاد ہے میر محمد اکرم خاں دادا ان کے دار الانشائے بادشاہی میں نواب یحیٰی خاں میر منشی کے ہمراہ تھے، بہت مرد سنجیدہ اور حقیقت آگاہ تھے۔ غرض میر مذکور صاحب دیوان پر بیان ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب دیوان ہیں؛

ساقی بغیر جام کے جی کا بچاؤ نہیں
جوں فیل مست آوے ہی ابر سیہ پلا

وله
کافر بتوں سے داد نہ چاہو کہ یہاں کوئی
مرجا ستم سے اُن کے تو کہتے ہیں حق ہوا

گر تیرے گل کے آنے نے کھوئی نہیں حیا اس
سجّاد کیوں پھرے ہی سجن آج فق ہوا

وله
یعقوب کے جب عشق پڑا سر پہ ٹوٹ کر
آنکھوں نے اُس کی رو دیا آخر کو پھوٹ کر

عشق میں جائے گا بے طرح مارا
بے طرح دل ہوا ہے آوارا

خط کتروا کے آج قینچی سے
ہم سے ملنے میں جائے ہی کترا

غم نہیں گر گم ہوا بالوں میں تیری جا کر دل
پیچ پر تجھ زلف کے گویا کہ اُس کو بل دیا

تجھ کو اے سجّاد غیر از خنجر بیداد کے
اور بھی کچھ ظالموں کی دوستی نے پھل دیا

بتان تو چاہتے سجّاد تجھ کو
کریں کیا پر خدا اسنے جو نچاہا

مقبول اس جہاں کا ہرگز غنی نہ دیکھا
راجہ وہی ہی جو کوئی یہاں سے گیا ہی راجہ

وله
اشتابی پلا لے کہ جاتا ہے ابر
جو کچھ باقی ساقی رہی ہو شراب

وله
دور میں رخسار کے تیری کہیں انصاف نہیں
خط چُرا لے جای دل کو اور باندھے جائے زلف

وله
جس خوبرو کی دل میں نہ عاشق سی ہو نفاق
کہتے ہیں ساری اُس کے تئیں حسن اتفاق

وله
ایک دل رکھتا ہوں جو چاہی سو لیجا دہو اُسے
خواہ زلفیں خواہ مژگاں خواہ ابرو خواہ چشم

وله
جب ہم آغوش یار ہوتے ہیں
سب مزے در کنار ہوتے ہیں

وله
بتوں کے تئیں کس قدر مانتا ہے
یہ کافر مرا دل خدا جانتا ہے

اے صنم زنّار پہنی تجھ وفا کے واسطے
ورنہ کوئی کافر بھی ہوتا ہی خدا کیواسطے

وله
کوئی جا کے قاتل کو سمجھائیے گا
کہ عاشق کا جی کھو کے کیا پائیے گا

کہا دل نے بولو یہ خوبوں کے تئیں
یہ دیکھو گے اپنا کیا پائیے گا

وله
میرے تمام حال کی تقریر ہے یہ زلف
روز سیاہ و نالۂ شبگیر ہے یہ زلف

وله
رہو آہ دل سوز میرے سے فرق
کہ ہے خوشہ چیں اُس کے خرمن کی برق

دل کو کبھی پیار دلا کر کے اے سجن		لاگا نہیں گلے سے مرے آج لگ	
لخت جگر ہمارا پانوں کے ساتھ کھا کر	ولہ	اگر تے ہو ہم سے باتیں اب تم چبا چبا کر	

باب الشین

۱- شورش

شورش تخلص، میر غلام حسین نام ہے۔ وطن عظیم آباد کے مشہور میر ہمنا کر کے تھے۔ بھانجے تھے ملا میر وحید کے۔ اور مشورہ سخن کا کیا تھا میر باقر حزیں تخلص سے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ "میرے آشنا تھے، اور بیماری میں غرور کی مبتلا تھے۔ فقط اپنے خیال فاسد سے انہوں نے اپنے کلام کی قباحتوں پر التفات نہیں کیا ہے، اس سبب سے سخن ان کا ہمیشہ مورد اعتراض سخن گیروں کا رہا ہے"۔ ایک تذکرہ شعرائے ہند کا زبان ریختہ میں انہوں نے لکھا ہے، لیکن وہ بھی بسبب ان کی خودپسندی کے خالی خلل اور زلل سے نہ تھا۔ سنہ ۱۱۹۵ گیارہ سو پچانوے ہجری میں اس سرائے فنا سے جادہ نوردِ منزل بقا کے ہوئے۔ دیوان ان کا زبان ریختہ میں مترتب ہے۔ یہ ان کے کلام کا منتخب ہے +

ہمارے پاس بھی آیا نہ آیا		بھروسہ کیا ہے جی آیا نہ آیا
کسی کو خم سے غرض ہی کسی کو جام سے کام	ولہ	قسم مغاں کی ہے ساقی کی مجھ کو نام سی کام
اُٹھی یہ اُلفتِ گل کے سبب سے سب ایذا		وگرنہ کیا تھا ہمیں ہم صفیر و دام سی کام
ہماری صبح رخِ یار شام زلفِ نگار		نہ مہر و ماہ کے ہے ہم کو صبح شام سی کام
ہر ایک دم میں ہمیں وصل و ہجر میں موجود		غرض نہ نام سے رکھتے ہیں نے پیام سی کام
رقیب گرچہ بہت برخلاف ہے شورش		ہوا کرے ہمیں ہے یار اپنے کام سی کام

باب الصّاد

۱- صائغ

صائغ تخلص۔ نظام الدین احمد نام۔ ساکن بلگرام۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ جہان قدیم سے میرزا محمد رفیع سودا کے، اور دوستانِ صمیم سے اس خاکسار کے تھے۔ بڑے صاحبِ درد و تاثیر، اور طبیعت کی گدازی میں بے نظیر۔ اچھا شعر جب کسی سے سُنتے، تو گھڑیوں روتے، اور بے چین رہتے عالم اخلاص اور دوستی میں زمانہ کے افتخار، استقامت طبع اور رسائی ذہن میں مستغنی روزگار تھے۔ سنہ بائیسویں تک جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے ہمیشہ مرشد آباد اور کلکتے میں ایام زندگی کے بسر کرتے تھے۔ آخر سنہ[1] ہجری میں ملکِ وجود سے رختِ سفر کا باندھ کے راہی کشور عدم کے ہوئے۔ فارسی دیوان مترتب ہے ان کا۔ اور ریختہ کا شوق کمتر تھا۔ یہ اشعار اس نکو کردار کے ہیں۔

سجن کی اُس محبت پر دیا تھا جان و دل صائغ		نہ تھا معلوم ہو جاوے گا وہ نامہرباں اپنا
جلے بھُنے ترے جس وقت آہ کرتے ہیں	ولہ	تو وہ دود دل سے جہاں کو سیاہ کرتے ہیں
قسم ہے تیری ہی، کہانے میں یار تیر نگاہ		جگر تلک نہیں دل کے تباہ کرتے ہیں
دہی ہوئے ہیں تب تاب جاں ستی آگاہ		جو کوئی دل سے گذر گاہ گاہ کرتے ہیں
خدا بچاوے غم و درد و ہجر عشق میں آہ		ڈبا کے زورقِ دل کو تباہ کرتے ہیں
نہ کوہ کن سی ہوئی بے ستوں میں صائغ راہ		بڑے وہ مرد ہیں جو دل میں راہ کرتے ہیں
ہوا ہے شوق موہن کو دھڑی ہونٹوں جمانے کا	ولہ	نہ جانوں کیا سبب یاقوت کے نیلم بنانے کا

[1] قلمی نسخہ میں سن وفات نہیں لکھا

یہ بلبل شاخ گل پر بیٹھ کر کیا شور کرتی ہے	صبا کا آج وعدہ ہے مگر کلیاں کھلانے کا

بابُ الضّاد

۱۔ ضیا

ضیا تخلص، میر ضیاء الدین نام، متوطن شاہ جہان آباد کے، میرزا محمد رفیع سودا کے ہم عصر، نظم ریختہ میں مالک تھے طبع بلند کے، او صاحب تھے ذہن ارجمند کے۔ دلّی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے، تو طور سکونت کا وہیں ٹھہرائے۔ ایک مدت اوقات اُسی شہر میں بسر کی، اور داد شعر و شاعری کی دی۔ اکثر سخنوروں کو اس دیار کے نسبت شاگردی کی اُس شاعر شیریں کلام کے ساتھ ہے، اقسام نظم میں ان سے بیشتر ہوئی فکرِ غزلیات ہے۔ قصیدے سے تو ان کو کچھ انکار سا رہا ہے، اور مثنوی کا خیال بھی کم تر کیا ہے۔ آخر عمر بلدۂ عظیم آباد میں استقامت اختیار کی تھی اور طبیعت اکثر ساتھ عزلت و گوشہ نشینی کے بار کی تھی۔ آشنا پرست اور دردمند ہر رنج و راحت میں ہمیشہ خورسند تھے۔ از بسکہ مدار دنیائے فانی کا فنا پر ہے راہ گذار جادۂ بقا کے ہوئے۔ مالک دیوان رنگین و متین کے ہیں۔ یہ شعر اس شاعر ذکی و ذہین کے ہیں :

باؤ بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا		آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کمُلانے لگا
گل کی رسوائی تجھے کیا بس نہ تھی اے ننگِ خلق		اُس کے کوچے میں ضیا پھر آج تو جانے لگا
پلا دے آبِ خنجر ہم کو ظالم تشنہ جاتے ہیں	ولہ	جو کوئی مرتا ہے اُس کے حلق میں پانی چواتے ہیں
ہے ماتم کس دوانے کا الٰہی آج صحرا میں		کہ سیلیں روتی پھرتی ہیں بگولے خاک اُڑاتے ہیں
ضیا رکھ ہاتھ سینے پر خبر دل کی بھی لے ظالم		کہ آج آنسو تری آنکھوں سے کچھ لوہو سے آتے ہیں
گریبان و خاک اُڑاتا جوں ابر و جوں بگولا	ولہ	صحرا میں تو نے مجنوں وحشی ضیا کو دیکھا
اسے آہ پیچ نکل نہ کہیں دل تھلک پڑے		یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

یترے ضیا کا حال میں پوچھا تھا شمع سے	اک آہ اس نے کھینچی اور آنسو ڈھلک پڑے

باب العین

۱- عزلت

عزلت تخلص، سید عبد الولی نام۔ خلف شاہ سعید اللہ سورتی کے۔ وہ شاہ سعید اللہ کہ سر دفتر فاضلان اور سر حلقہ صاحبدلان تھے۔ اور بادشاہ عالمگیر کے تئیں اس مرجع خلائق سے اعتقاد صادق تھا۔ اصل وطن شاہ صاحب مذکور کا کوئی قصبہ ہے قصبات لکھنؤ سے، لیکن ازبسکہ اقامت سورت میں اختیار کی تھی سورتی مشہور ہوئے۔ غرض جب عزلت مذکور اپنے والد کی وفات کے بعد دلی میں آگئے، تو شاہ جہان آباد کے سخنوروں کی ہم صحبتی سے فکر میں ریختہ کے پڑے، تلاش پر نظم کی دل دیا، اور حوصلہ شعر و شاعری کا حاصل کیا۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "باوصف تمکنت و فضیلت کے اوضاع و اطوار اس عزیز کے خالی سبکی اور بے مغزی سے نہ تھے۔ نواب علی وردی خاں مہابت جنگ مغفور کے عہد دولت میں وارد مرشد آباد کے ہوئے، اور مورد عنایت و امداد کے ہوئے۔ حرکات ان سے خلاف ان کے منصب کے عمل میں آتے تھے اور آنکھوں میں ارباب تمیز کی کیفیت کو اعتبار کی گھٹاتے تھے۔ نواب مرقوم الصدر کی وفات کے بعد سرزمین دکن نور جمال سے اپنے منور کی، اور بقایائے عمر اسی مملکت میں بسر کی۔" دیوان ان کا مدت سے پا چکا انتظام ہے، یہ ان کا منتخب کلام ہے۔

فقیروں سے نہ ہو نیرنگ لالن فصل ہولی میں		ترا جامہ گلابی ہے تو میرا خرقہ بھگواں ہے
بہار آئی چمن میں غل ہے بلبل کی صفیروں کا	ولہ	جدا ہے ہر گلی میں شور زنجیر اسیروں کا
عبث توڑا مرا دل ناز سکھلانے کے کام آتا		یہ آئینہ تھا، اُس خودبیں کے اترانے کے کام آتا
جلایا مصحف دل تو نے کیوں برق تغافل سے		جو سچ بولوں تجھے جھوٹی قسم کھانے کے کام آتا

بتوں کا جور دیوانہ دوا کرتا نہیں گا	ولہ	کہ پتھروں کو وہ صندل درد سر کا جانتا ہیں گا
بگولا بن کے راہ بی ستوں میں کوہ کن اب تک		سم گلگوں کی ماتی ٹاپ ہاتھ ہل ہل چھانتا ہیں گا
سیہ روزی ہیں میری قدر کو احباب جا کیا نہیں		اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہیں گا
مجھے چاہے کہ پتھر مارے جب دشنام سکیں گا		غلیل ابرو کے عزلت کس مزے سے تانتا ہیں گا
ہوا ہی داغ اس کا مغز نازک آتش گل سے	ولہ	چمن زادوں میں اک مرزا منش لالہ ہوا پیدا
جدھر نکلے وہ ہولی باز باتجا	ولہ	گلابی ہے غبار رہ وہاں کا
نخل امید بیوفایوں سے	ولہ	دل سلامت رہے تو پھل پانا
اول ہمیں عشق اپنے سے بیہوش کیا	ولہ	یاد اپنی دی پھر ہم کو فراموش کیا
ہم نے بھی جرس وار اے یار سفری		دل کو نالاں لبوں کو خاموش کیا
ہماری گرد سے دامن جھٹک گیا دلدار	ولہ	کلال سا پڑا جلتا ہے اب تلک یہ غبار
یاروں کی خاطروں کی کیا دل مرا خبر لے	ولہ	ہیں پر غبار سب دل کیا خاک جا خبر لے
جوں شب کہ صبح ہو جائے تب آفتاب آوے		ہم جل کے ہو گئے راکھ جب لگ وہ آ خبر لے
ہم ہیں مفلس یار کی قیمت گراں کیا کیجئے	ولہ	ہم زمین اور اس کا رتبہ آسماں کیا کیجئے
بچا دل زلف کے عقرب سے تو کیا	ولہ	کہ چوٹی ناگنی پیچھے پڑی ہے
تری زلف کی شب کا بیدار میں ہوں	ولہ	تجھ آنکھوں کے ساغر کا میخوار میں ہوں
کدھر بہتا پھرتا ہے اسے گریۂ غم		کہ آنکھوں سے تیر اخریدار میں ہوں
پیر ہو یا شیخ ہو ہے دیکھو طفلاں کا مرید	ولہ	مردہ بولا ہے کفن پھاڑ قیامت آئی
دل ہیں رندوں کے پھپولا ہوا عمامۂ شیخ	ولہ	یا رب اس بزم سے یہ زہر کا ٹکڑا جاوے
کھلا کے دل جسے پالا سو ہے مراد الی	ولہ	جناب پاک جنوں مدظلہ العالی
شانہ اس زلف میں پھرتے یہ سخن کہتا تھا	ولہ	بات کہتے ہی شب وصل چلی جاتی ہے
شکستہ گر ہوا دل اب نظر نہ کر مجھ کر		یہ ٹوٹے آئینے میں منہ تری بلا دیکھے

۲۔ عشق

عشق تخلص، شاہ رکن الدین نام۔ شاہ گھسیٹا کر کے مشہور تھے۔ شاہ جہاں آبادی۔ نواسے شاہ فرہاد کے عمدہ مشایخوں میں سے ولی کے۔ جہاں بیان ہوئی۔ شاہ فرہاد کی حالت سکر و مستی ہے، تو کہتے ہیں کہ اس عالم میں تعظیم بادشاہ کی نہیں کی ہے۔ غرض عشق مذکور ایام شباب میں شاہ جہان آباد سے مرشد آباد میں آئے، اور خواجہ محمدی خاں مرحوم کے ساتھ لباس دنیاداری میں ایک مدت ایام حیات بعزت تمام بسر لائے۔ اگرچہ نہ کچھ خدمت نہ کام رکھتے تھے، لیکن آنکھوں میں امرایان مرشد آباد کے نہایت احترام رکھتے تھے۔ بعد ایک عرصہ کے اپنے بزرگوں کے طور پر مزاج فقر و درویشی کی طرف آیا، اور تکیہ فضل ایزدی پر کر کے طور استقامت کا عظیم آباد میں ٹھہرایا۔ پھر تو نہایت زور و شور کے ساتھ مشیخت پناہی کی، اور معتقدوں کے ہجوم سے عالم درویشی میں شاہی کی۔ طالبان راہ عشق کو ہدایت مطلب سے خالی نہیں چھوڑا۔ بقول علی ابراہیم خاں مرحوم ۱۱۹۵ھ گیارہ سو پچانوے ہجری تک داد حال و قال کی دی۔ آخر بلدہ عظیم آباد میں مرشد حقیقی قضا کے ارشاد دعوت پر لبیک اجابت باآواز بلند کہی۔ دیوان اس مشیخت دستگاہ کا زبان ریختہ میں مرتب ہے، یہ اس کا منتخب ہے۔

کہنے کو ادھر اُدھر گئے ہم — تھے تیری طرف جدھر گئے ہم
تا جاں نہ ہوئی عدول حکمی — تو نے کہا مر، تو مر گئے ہم

بات کہنے کی نہیں طاقت شکایت کیا کروں — عشق رخصت دے تو شور حشر اب برپا کروں

وله

نے درد دل ہے باقی نے آہ و نے فغاں ہے — اے سوز عشق سچ کہہ تو ان دنوں کہاں ہے

وله

دیکھنے بن اُس کے یک دم چین یہ رہتا نہیں — اس دل کافر کے ہاتھوں سخت گھبرائے ہیں ہم

وله

جوں آفتاب تاباں گو نام کو یہاں ہوں — یہ پرتو ہے تیرا ٹک دیکھ میں کہاں ہوں
گو نام اور نشاں ہے ظاہر میں میرا یارو — جو دیکھو فی الحقیقت ہوں وہم یا گماں ہوں
باتیں نہ سن تو میری جل جائے گا دیوانے — میں برق آسماں ہوں یا عشق کی زباں ہوں

عرش تا فرش سیر کر دیکھا	وله	تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
چشمِ تحقیق سے جہاں ڈھونڈھا		کافر ہوں تجھ سوا اگر دیکھا
تیرے نام پر تڑپتا ہوں		اس طرح کا کہیں جگر دیکھا
آبلہ آبلہ ہوئے سب عضو		نخلِ اُلفت میں یہ ثمر دیکھا
سحر میں سامری کے کیا قدرت		تیری نظروں میں جو اثر دیکھا
اپنے ہم چشم سے لگا کہنے		نالہ و آہ گھر بہ گھر دیکھا
ٹک اک انصاف سے اگر دیکھو		عشق سا کوئی چشم تر دیکھا
دیدۂ دل جو کر کے وا دیکھا	وله	حرم و دیر میں خدا دیکھا
ہنس کے کہنے لگا ملامت گر		عشق میں تو نے کیا مزا دیکھا
اس کی لذت کو دل سمجھتا ہے		اُس کو میں کیا کہوں کہ کیا دیکھا
دشت تجھ کو قسم ہے مجنوں کی		عشق سا کوئی برہنہ پا دیکھا
از عدم تا وجود آ دیکھا	وله	جان دیکھا سو بے وفا دیکھا
اپنی آنکھوں سے دیکھ ای خوش چشم		مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا دیکھا
تجھ سے کوئی آشنا نہ ہوا یا ہو		پر تجھے سب سے آشنا دیکھا
اُس کے دہن تلک نہ پہنچے ہم		خاک میں آپ کو ملا دیکھا
ظالم اپنی جفائیں کہہ تو کبھو		لب مرا شکوہ میں بہا دیکھا
کبھو غم سے جدا نہ دیکھا ہیں		عشق کو جا کے بارہا دیکھا
میں کافر ہوں اگر منظور ہووے لطف مرہم کا	وله	کہ یہ داغ جگر ہے یادگار اُس یار ہمدم کا
ترا یہ وعدۂ فردا تو دل کو روز فردا ہے		کہاں فرصت ہے ای ناداں بھروسا ہی کہاں دم کا
رُلانے میں مرے کچھ تجھ کو ہیگا فائدہ کہ تو		مگر اتنا کہ گھر اپنا ڈبویا اور مردم کا
کفایت ہے بروزِ حشر مجھ کو شفقتِ حیدر		کہ جس کے نام سے زہرا ہوا پانی جہنم کا

لخت دل زینت داماں نہ ہوا تھا سو ہوا	ولہ	چاکِ دل تا بہ گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا	
عشق بازی میں پشیماں نہ ہوا تھا سو ہوا		بے وفائی تری دل دیکھ کے ای وعدہ خلاف	

۳- عیش

عیش تخلص، میرزا عسکری نام، بیٹے مرزا علی نقی کے۔ وہ مرزا علی نقی جن کو نواب حسین قلی خاں کی طرف سے امینی جہانگیر کی ایک مدت رہی، اور زندگی اُنھوں نے اس خدمت میں نہایت تشخیص و حکومت کے ساتھ بسر کی ہے۔ غرض میرزا عسکری مذکور جوان مودب باشعور اور تہذیب اخلاق سے معمور ہیں۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ میرے آشنا ہیں، بہت ہی باشرم و باحیا ہیں۔ وطن تو ان کا شاہ جہان آباد ہے، لیکن ایک مدت سے مرشد آباد میں آکر رہے تھے، اور بعضے خدمتوں کے ساتھ سرکار میں ناظم بنگالہ کے اوقات بسر کرتے تھے۔ دیوان ان کا مورد اشتہار ہے، یہ اُن کا خلاصۂ افکار ہے +

وہ اگر آوے سر بام کہیں	میں بھی کر لوں اُسے سلام کہیں
کیا ہے یہ قطرہ قطرہ، دے ساقی	ایک باری تو بھر کے جام کہیں
اس شب وصل کی سحر اسے چرخ	لیجو مت مجھ سے انتقام کہیں
یہ غزل عیش سے ہے تصدق سوز	مجھ سے ہوتی تھی انصرام کہیں

بابُ الفاء

۱- فقیر

فقیر تخلص، میر شمس الدین نام، متوطن شاہ جہان آباد کے۔ اُستادوں میں سے شعرائے ہندوستان کے تھے۔ اہل ہند میں مجال کسی کی نہ ہوئی کہ سخن گستری میں مقام پر فیضی کے، اور خوش بیانی میں جگہ پر ان کے تکیہ کر سکے۔ دار الخلافہ شاہ جہان آباد میں ہر روز زندگانی کا انھوں نے

نہایت غربت اور استغنا کے ساتھ بسر کیا ہے، اور اس عرصہ میں دکن کا بھی سفر کیا ہے۔ چنانچہ بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے۔ اقسام نظم میں کوئی قسم نہیں رہی کہ ان کے خامہ سحر آفرین نے اُس میں جادو کاری نہیں کی، اور انواع شعر میں کوئی نوع نہیں چھوٹی کہ ان کے کلک گوہر سلک سے اُس میں دُر و باری نہیں ہوئی۔ اکثر علوم میں کتابیں انکی تصانیف سے ہیں۔ خصوصاً عروض و قوافی میں کیا خوب رسالے تالیف کئے ہیں۔ سنہ ۱۲۱۱ گیارہ سو سترہ ہجری میں واسطے حج و زیارت کے تشریف لے گئے، اور بعد حصول سعادتِ زیارت کے جب کہ پھرے تو کشتیِ حیات اُس آشنائے بحر معنی کے گرداب ممات میں تباہی ہو کر ڈوبی یعنی اس ناخدائے جہاز سخندانی کے جہاز کو باد مخالف نے صدمۂ طوفان دیا، اور دریائے سقط[1] میں غریق بحر رحمت گیا۔ اگرچہ کہنا ریختہ کا اُس اہل کمال کا دوں مرتبہ کمال تھا، لیکن اکثر واسطے تفنن طبیعت کے اس کا بھی اشتغال تھا۔ یہ گوہر آبدار اس بحر سخن سنجی کے آویزۂ گوش روزگار ہیں

درد مندوں سے نہ پوچھو کہ کدھر بیٹھ گئے
تیری مجلس میں غنیمت ہی جدھر بیٹھ گئے

ہے غرض دید سے یاں کام تکلف سے نہیں
خواہ ادھر بیٹھ گئے خواہ اُدھر بیٹھ گئے

دیکھا ہووے گا مرے اشک کا طوفاں تم نے
لاکھ دیوار گرے سیکڑوں گھر بیٹھ گئے

کس نظر باز نے اُس باز کو بخشی پرواز
سیکڑوں مرغ ہوا پھاند کے پر بیٹھ گئے

کم ہے آواز ترے کوچہ کے باشندوں کی
نالہ کرنے سے گلے اُن کے مگر بیٹھ گئے

مفت اُٹھنے کے نہیں یار کی کوچہ سے فقیر
جب کہ بستر کو جما کھول کمر بیٹھ گئے

ولہ

آہ تو نے تو کئی بار ہلایا ہے فلک
زیادہ گستاخ نہ ہو عرش کو پہنچے گی دھمک

کل ہی کی شب کا ہی مذکور کہ جبریل آئے
خوب معلوم نہیں آپ تھا یا اور ملک

[1] آج کل باندھ بولتے ہیں۔

۲- فغاں

فغاں تخلص، اشرف علی خاں نام تھا۔ شاہ جہان آبادی۔ خلف میرزا علی خاں نکتہ کے۔ آٹھ پہران کو خوش طبعی اور خوش اختلاطی سے کام تھا۔ کوکے تھے احمد شاہ بادشاہ کے، اور مربی گری سے ظرافت کی ندیم تھے جہاں پناہ کے۔ چنانچہ ظریف الملک کوکے خاں بہادر حضور سے بادشاہ کے خطاب پایا تھا۔ اور مرتبہ کو شوخی کے ساتھ لطیفہ سنجی کے بہت دور پہنچایا تھا۔ دِلّی سے مرشد آباد میں اپنے چچا کے پاس، کہ محمد ایرج خاں کر کے مشہور تھے، وارد ہوئے۔ لیکن نہ رہے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر شاہ جہان آباد چلے گئے۔ بعد کئی برس کے عظیم آباد میں آئے، اور طور بود و باش کے وہاں ٹھیرائے رفاقت میں مہاراجہ شتاب رائے کے چند مدت اوقات کاٹے، اور لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ہی میں دن رات کاٹے۔ اتفاقِ اصلاحِ سخن ان کو شیخ علی قلی ندیم تخلص سے ہوا ہے۔ نظم ریختہ میں طبیعت ان کی رسا ہے۔ بسنہ ۱۱۸۶ گیارہ سو چھیاسی ہجری میں اس حباب کو دریائے فنا کے نزا ٹھٹا سمجھ کر آشنا بحرِ بے کنارِ بقا کے ہوئے۔ بلدۂ عظیم آباد اُس شیریں کلام کا مدفن ہے، اور تلخی روز حشر تک اب وہیں مسکن ہے۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، غزلیں منتخب ان کے دیوان کی لکھی گئی یہاں ہیں +

شکوہ کرے ہے تو جو مرے اشک سُرخ کا		تیری کب آستیں مری لوہو سے بھر گئی
ہستی کے خرابے نظر آتے جو عدم میں	ولہ	ہرگز کوئی اُس خواب سے بیدار نہ ہوتا
اے شیخ اگر کفر سے اسلام جدا ہے		پس چاہیئے تسبیح میں زنّار نہ ہوتا
مجھے تو تعزیہ دار اپنا کر گئے اپنے	ولہ	کہ جو شفیق تھے وہ دوست مر گئے اپنے
عبث تو تڑپے ہے کنج قفس میں مرغ چمن		اسی تڑپ میں تو یہ بال و پر گئے اپنے
مرا مقام ہے اس سرزمیں پہ عاریتاً		اُدھر کو جانا ہے آخر جدھر گئے اپنے
کسے تو ڈھونڈھتا پھرتا ہے اے فغاں تنہا		کہ اس سفر کے مسافر تو گھر گئے اپنے
شب فراق نہ تنہا مجھے رُلاتی ہے	ولہ	یہ صبح وصل بھی آنسو سے منہ دُھلاتی ہے

اگر میری زباں پر بار دیگر انتظار آوے — ولہ — ابھی رونے پہ ظالم دل مرا بے اختیار آوے
دل زلف میں الجھا مجھے آرام یہی ہے — ولہ — میں صید بلاکش ہوں مرا دام یہی ہے
تار کی طرح کہیں زلف بتاں سے ٹوٹے — ولہ — یا الٰہی دل بیمار بلا سے چھوٹے
ضعیف ہے دل بیمار اس قرینے سے — ولہ — اٹک کے آہ نکلتی ہے میرے سینہ سے

عشاق تیری گرمی بازار کر گئے — ولہ — اس جنس کو گراں یہ خریدار کر گئے
اٹھ چکا دل مرا زمانے سے — ولہ — اڑ گیا مرغ آشیانے سے
دیکھ کر دل کو مڑ گئی مژگاں — تیر خالی پڑا نشانے سے
ہم نے پایا تو یہ ستم پایا — اس خدائی کے کارخانے سے

غیر از دوئی کے مانع دیدار کون ہے — ولہ — وہ یار ہو گیا تو پھر اغیار کون ہے
بیم غضب رکھے ہے مجھے مغفرت سے دور — گر وہ کریم ہے تو گنہگار کون ہے
جاگا نہ کوئی خواب عدم سے کہ پوچھتے — آسودگانِ خاک میں بیدار کون ہے
میں مر گیا پہ آہ نہ پوچھا فغاں مجھے — درد جگر کسے ہے یہ بیمار کون ہے

۳۔ فرحت

فرحت تخلص، شیخ فرحت اللہ نام۔ بیٹا شیخ اسد اللہ کا۔ اولاد سے قاضی مظہر کے، وہ قاضی مظہر کہ جانشین مرزا شاہ بدیع الدین مدار کے تھے۔ وطن بزرگوں کا ان کے ماوراء النہر ہے، لیکن فرحت مذکور نے دلّی میں پرورش پائی ہے، اور عاشق مزاجی و دل بستگی ہی میں عمر گنوائی ہے۔ ہمیشہ بند عشق میں مسلسل مویوں کے گرفتار، اور سدا درد عشق سے بیگانہ خوبوں کے یار۔ شاعر کہن مشق و ہم صحبت شعراء نامدار شاہ جہان آباد۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "یہ عزیز میرا اخلاص مند تھا، اور عسرت کا مورد گزند تھا۔ جب کہ دلّی سے مرشد آباد میں آیا، اور طور سکونت کا وہاں ٹھیرایا، جو مجھ سے ہو سکتا تھا خبر گیری ان حال گاہ گاہ ہوتا تھا۔ غرض بہت تنگی معیشت کے ساتھ عزیز

کانباہ ہوتا تھا۔ آخرالامر سنہ ۱۱۹۱ گیارہ سو اکانوے ہجری میں اُسی بلدے کے اندر انتقال کیا، اور اس دارِ محن سے، خلاف اپنے تخلص کے بہت مغموم گیا۔ زبان ریختہ میں اُس نے بہت کچھ کہا ہے، یہ منتخب اُس کے دیوان کا ہے ◆

گذرے اگر چمن میں وہ گلعذار اپنا — دیں چھوڑ بے کلی سے گل شاخسار اپنا

ولہ

تاثیر آہ میں نے نالے میں ہے اثر کچھ — ہووے وہ آہ یارب کس طرح یار اپنا

جاوے کہیں بھڑک مت آتش سے دل کی میرے — رکھ دور مجھ سے دامن اے کوہسار اپنا

اُس شوخ نے یہ پوچھا فرحت سے کل کہ تو نے — اس طرح کیوں گنوایا صبر و قرار اپنا

آنکھوں میں اشک بھر کر بولا نہ پوچھ ظالم — ہرگز نہیں ہے دل پر کچھ اختیار اپنا

۴۔ فدوی

فدوی تخلص، میرزا محمد علی نام، معروف میرزا بچو، متوطن تھے اُس اُجڑے نگر کے جو کہ مشہور شاہ جہان آباد، کر کے۔ نظم ریختہ میں اُستاد ہے۔ تلاشِ معنی میں فکرِ رسا رکھتے تھے، اور بیان حسن میں دل درد آشنا۔ علم موسیقی ہندی میں مناسبت بہت درست، اور تان کی سستی اور چستی کے جاننے میں نہایت چالاک و چُست۔ چندروز انہوں نے اوقات مرشد آباد میں بسر کی ہے، لیکن اس سیر و تماشے کے ساتھ جو کہ وضع اہل نظر کی ہے۔ آخر شہر عظیم آباد میں سکونت کا اتفاق ہوا تو وضیع و شریف اس شہر کا ان کا مشتاق ہوا۔ فدویت میں معارف آگاہ شاہ گھسیٹا کے حاضر رہتے تھے، اور فیض صحبت سے اُس عرفان پناہ کے کسب علوم ظاہری اور باطنی کا کرتے تھے چنانچہ اُسی شہر میں اس کہنہ رباط مسافر کش ہستی سے دل اُٹھایا، اور ایوانِ مہمان دوست عدم میں اسباب سکونت کا بھجوایا۔ زبان ریختہ میں شاعر شیریں بیان ہے، یہ اُس کا منتخب دیوان ہے ◆

گر خاک پہ میری کبھی اے یار گذرنا — مت بھول کے ہرگز مع اغیار گذرنا

ایسا نہ ہو رندوں کی کزک ہو کہیں مندیل — میخانہ سے اے شیخ خبردار گذرنا

ضد دیکھیو خوباں کی کہ اک آن کی خاطر — مر جائے جو عاشق تو نہ زنہار گذرنا
اُس بو کے تصدق ہیں کہ اُس گل کی گلی سے — ہے بادِ صبا کے تئیں سو بار گذرنا
گل یار کے کوچہ کی طرف گذریگا فدوی — مت آج سے تو اُس طرف اغیار گذرنا

وله

ہم کو تو وفا سے نہیں اے یار گذرنا — پر تو بھی جفا سے نہ ستمگار گذرنا
تجھ کو نہیں آنکھوں کی قسم تیر نگہ سے — ٹک دل کو بچا سینے کے تو پار گذرنا
جب یار کے آگے سے چلے قافلہ دل کا — اے اشک تو ہو قافلہ سالار گذرنا
گر ننگ و حیا تم نہیں جاتے تو نہ جاؤ — ہے مجھ کو تو اُس کوچہ سے لاچار گذرنا
شاید نظر آجائے کبھو در پہ تو سو بار — فدوی کے تئیں ہو پسِ دیوار گذرنا

وله

وہ کافر ہماری شبِ تار ہے — جسے دیکھنا مہر کا عار ہے

بابُ القاف

۱- قایم

قایم تخلص، شیخ محمد قایم نام، متوطن چاند پور ندبینہ کے۔ نظم ریختہ میں اُستاد مسلم الثبوت تھے۔ [غالباً صحیح نام نگینہ ہے ۱۲]
ساتھ طبعِ بلند اور ذہنِ رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف۔ کہتے ہیں کہ ابتدائے مشق میں مشورہ سخن کا انہوں نے خواجہ میر درد تخلص سے کیا ہے، اور آخر سخن سنجی میں اتفاق اصلاح کا ان کو میرزا محمد رفیع سودا سے ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے، راقم آثم کو تو طور گویائی کا اس سخن آفرین کے نہایت مرغوب ہے۔ طوطی کو اقرار تلخ گفتاری کا سامنے اُس شیریں مقال کے، اور خامۂ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا روبرو اُس نازک خیال کے۔ صفائے بندش سے اُس کی آئینہ کو طلب صفائی دام اور خجالت ہے اُس کلام رنگین کے گل کو شکستہ رنگی سے کام۔ آبداری اُس نظم صفا پرور کی رشک افزا آب گوہر کی، اور موجزنی اُس طبع معنی خیز کی حسد انگیز چشمۂ کوثر کی۔ افسوس ہے ایسے شخص کا

اس جہان فانی سے اُٹھ جانا، اور داغِ حسرت سے دلوں کو اربابِ فہم کے جلانا۔ اُس عندلیبِ شاخسار سحر بیانی نے شاید سنہ ۱۲۱۰ھ بارہ سو دس ہجری میں، اُدھر ہی نواحِ وطن میں اپنے، اس دار فانی سے سیر عالم باقی کی کی، اور عجب طرح کی ایذا جان کو اہل معنی کے دی۔ اگرچہ اقسامِ نظم میں کوئی قسم اس شیریں کلام سے نہیں رہی ہے، لیکن رغبتِ طبیعت کے ساتھ غزل اور مثنوی بیشتر کہی ہے۔ دیوان ان کا بھرا ہوا اشعار آبدار سے ہے، یہ ان کے منتخب افکار سے ہے۔

دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا		اُٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا
دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا	وله	آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم		کیا کروں پر رہا نہیں جاتا
یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام اسی کا	وله	پر دیکھیو لینا نہ کہیں نام کسی کا
خوباں کی طرف رکھنے کا بندہ ہوں میں قائم		ملتے ہیں کہیں نام ہے بدنام کسی کا
بنی بھوؤں سے ڈرا چاہئے کہ کہتے ہیں	وله	کرے ہے کاٹ سروہی سے بیشتر اونا
جب تک کہ ہے تو ہم ہیں ترے ساتھ ہمیشہ	وله	جوں موج کہ نت لازمہ ہے آب رواں کا
عہدہ سے اُس صنم کے برآیا نہ جائے گا	وله	یہ ناز ہے تو ہم سے اُٹھایا نہ جائے گا
کعبہ اگر جو ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ		کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا
ہم نے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا	وله	ہچکی گر آئے تو سمجھے کہ ہمیں یاد کیا
کہاں ہے شیشۂ مے محتسب خدا سے ڈر	وله	مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا
دل پا کے اُس کی زلف میں آرام رہ گیا	وله	درویش جس جگہ کہ ہوئی شام رہ گیا
میں اس چمن سے اور یہ مجھ سے چمن گیا	وله	لے دل میں اپنے حسرتِ سرو چمن گیا
شیریں تو ساتھ خسرو کی گرذوق سے معاش		پتھر تھا تیری چھاتی پہ سو کوہکن گیا
ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر		روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی میں اور آپ ہی من گیا
روؤں گا زیر سایہ دیوار بیٹھ کر		جس دن تری گلی میں کوئی داد بن گیا

وله
زلف دیکھی تھی کس کی خواب میں رات ہم سحر تک تھے پیچ و تاب میں رات
خوب نکلے ہم اُس کے کوچہ سے ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات
لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل دل گرا شاید اضطراب میں رات

وله
بھلا اے ابر مژگاں اب تو بس کر ابھی تو کھل گیا تھا تو برس کر

وله
بے شغل نہ زندگی بسر کر گر اشک نہیں تو آہ سر کر
کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

وله
کیوں کیا مجھ کو تو صیاد گرفتار قفس میں نہ شائستۂ بسمل نہ سزاوار قفس

وله
جب موج پر اپنی آگئی چشم دریا دریا بہا گئی چشم

وله
اب کے جو یہاں سے جائینگے ہم پھر تجھ کو نہ مُنہ دکھائیں گے ہم
ہاں کیوں نہ ملیں گے تجھ سے ظالم جب گالیاں نت کی کھائینگے ہم
آزردہ ہو غیر سے لڑو یہاں اس عہد سے کب بر آئیں گے ہم
ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم
جوں چاہیئے چاہ کا سرشتہ قایم ہیں تو کر دکھائیں گے ہم

وله
نہ دل میں آب ہے نہ نم رہا ہے آنکھوں میں کبھی روئے تھے سو خوں جم رہا ہے آنکھوں میں
میں مر چکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کے لئے حباب وار ذرا دم رہا ہے آنکھوں میں

وله
میں کہا عہد کیا کیا تھا رات ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

وله
نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی جب لڑیاں یکایک کھل گئیں دونوں طرف سے دل کی پھر کلیاں

وله
جب اُسے غیر سے ہو مین کھلانے کا شوق سرمہ کے واسطے بھیجے ہے صفہان مجھ کو

وله
راہ کے بیچ جو رکھتا ہوں اُسے گھیر کبھو ہنس کے کہتا ہے کہ اب چھوڑ مجھے پھیر کبھو

وله
اتنی اے دیدۂ و دل مجھ پہ نہ بیداد کرو دیکھیں کیا ہووے خدا کو تو ٹک اک یاد کرو

وله
کبھی دکھا کے کمر اور کبھی دہاں مجھ کو نپٹ تنگ کیا تو نے اے میاں مجھ کو

تو اپنے واسطے اے باغباں نہ کاوش کر
نپٹ سہے ہے سایۂ دیوار گلستاں مجھ کو

وله
جو کہ چہلیں تھیں سو ہائے گئیں وہ یار کے ساتھ
سر پٹکنا ہی پڑا اب در و دیوار کے ساتھ

ایک ہم خار تھے آنکھوں میں سبھی کے سو چلے
بلبلو خوش رہو تم اب گل و گلزار کے ساتھ

میں ہوں دیوانہ سدا کا نہ مجھے قید کرو
جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

وله
تھی شرط مجھے اُس سے تو اک رات بسے کی
گیا ہے کر دل اُس زلف سے ہر گز نہ بھر آیا

وله
تیغ چڑھ اُس کی سان پر آئی
دیکھیں کس کس کی جان پر آئی

وله
دہن کو تیرے پایا بات کہتے
ہماری جز رسی میں کیا سخن ہے

وله
دل ڈھونڈھتا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے
یاں راکھ کا اک ڈھیر اور اک آگ دبی ہے

وله
میں جاتا ہوں کعبہ سے اب دیر کو
بھلا یہ بھی دیکھوں خدا کیا کرے

وله
مُردنِ دشوار میں یہ حال سب بے تقصیر ہے
حسرتِ دل سو طرف سے اُس کی دامنگیر ہے

قتل کرنے سے مرے تو بھی ہوا کچھ منفعل
غرقِ آبِ شرم میں اب تک دمِ شمشیر ہے

وله
مر جائیے کسی سے پہ اُلفت نہ کیجئے
جی دیجئے تو دیجئے پر دل نہ دیجئے

وله
مرا کوئی احوال کیا جانتا ہے
جو گذرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے

وله
یاس میں تجھ غم کے میں اپنی بھی غم خواری نہ کی
دل دیا تجھ کو تو میں نے کچھ گنہگاری نہ کی

دم بدم اس رنجش بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ
دل دیا تجھ کو تو میں نے کچھ گنہگاری نہ کی

بعد خط آنے کے اُس سے تھا وفا کا احتمال
لیک وہاں تک عمر نے اپنی وفاداری نہ کی

وله
دل مرا دیکھ دیکھ جلتا ہے
شمع کا کس پہ دل پگھلتا ہے

گندمی رنگ جو ہے دنیا میں
میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہے

ہم نشیں ذکرِ یار کر کچھ آج
اس حکایت سے جی بہلتا ہے

وله
گو ہم سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے
کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

وله
زاہد درِ مسجد پہ خرابات کی تو نے
جی بھی یہی چاہے تھا کرامات کی تو نے

ایدھر تو میں نالاں ہوں اُدھر غیر نجابہ میں
اب کس سے مری جان ملاقات کی تو نے

مرا جی تجھ کو کیا پیارا نہیں ہے
ولہ
پر اتنا بھی تو ناکارہ نہیں ہے

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قایم
ولہ
مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

کیا ہی مکھڑا ہے یہ کہ جس کے حضور
ولہ
آئینہ کی قلعی اُدھڑتی ہے

قایم آیا ہے پھر وہ بن ٹھن کر
دیکھیں کس کس کی یاں بگڑتی ہے

کیا پشم ہے دنیا کہ یہ ارباب نعیم
رباعی
بے قرب کریں ہم کو دکھا کر زر و سیم

مسجد میں خدا کو بھی نہ کیجے سجدہ
محراب جو خم نہ ہو برائے تعظیم

مثنوی بردیہ

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

ان دنوں چرخ پر نہیں ہے مہر
گود میں کانگڑی رکھے ہے سپہر

پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے
سبز وہ شال کی رضائی ہے

دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات
کالی کمل میں رات کاٹے ہے رات

چرخ کی اطلسی قبا ہے ہمیش
نہیں یہ کہکشاں ہے دانا کیش

ندی پر آ کے بیٹھے جو بگلا
پروں سے اپنے اوڑھے ہے وہ گلا

برف کو جوں میں یوں پڑی ہے صاف
جوں کہ اُڑتا ہے پنبۂ نداف

کہرے کو دیکھ کہتے تھے سب یار
ٹھنڈ سی ہے فلک کے جی میں غبار

پر جو دیکھا ہے غور کریں آپ
نکلے ہے منہ سے آسماں کی بھاپ

باد چلتی ہے بسکہ تند اور سخت
روز و شب کانپتے رہے ہیں درخت

گرچہ سرما سے خاص و عام ہیں شل
پر کہوں کیا میں حال اہل دول

لپٹے رہتے ہیں روئیں میں مجبور
جس طرح ناشپاتی و انگور

جا کے حلوائی کو جو دیکھو کہیں
قایم اب سردی کا ہے یہ مذکور

برفی چھٹ کچھ دکاں میں اُس کے نہیں
شعر ہو گر خنک تو رکھ معذور

مخمس

شیخ تو نابود ہو وے یا تراپندار نیست
کام کیا ہے مجھ کو گو ہوں راہب و پندار نیست

بتکدہ ویراں ہوں یا ہوں برہمن یکبار نیست
کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست

ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

عاشقوں کی رونے کی کچھ اور ہی ہوتی ہے دھن
ہم نہ کہتے تھے تجھے ظالم کہ آیہ بات سُن

دیکھ ہم روتے ہیں لختِ دل جو جی چاہے تو چن
ابر را با دیدۂ گریانِ من نسبت مکن

نسبتِ باریدگی دارد و لے خونبار نیست

دیکھ حال مرا اُٹھا کے سو سو حیلے
کہتی تھی جو کفش میں نہ چھوڑوں گی قدم

رباعی

ساتھی بھاگے ہر اک طرف کو جی لے
سو اُس کے بھی ہو چکے ہیں کتنے ڈھیلے

۲۔ قدرت

قدرت تخلص، شاہ قدرت اللہ نام۔ ساکن شاہ جہان آباد کے۔ مشہور سخنوروں میں سے تھے۔ رشتہ دار تھے میر شمس الدین فقیر کے۔ صاحب مذاق تھے چاشنیِ درد و تاثیر کے نظم ریختہ میں ذہن رسا رکھتے تھے۔ خاطر سخن گستر اور طبع معنی آشنا رکھتے تھے۔ طرز مضمون آفرینی سے ماہر، اور اک شکستگی و برشتگی کلام سے اُن کے ظاہر۔ اکثر فکر اشعار فارسی کی بھی کرتے تھے، لیکن نظم ریختہ پر مرتے تھے۔ تازہ کرنے میں مضمون کے اپنے ہم عصروں میں ممتاز، اور صفائی میں بندش کی نازک خیالوں سے ہند کے دمساز تھے۔ وارستہ مزاجی کے یار، اور آزادہ حالی سے سروکار۔ ایک مدت سے دلی کو چھوڑا تھا، اور وارد و مرشدآباد تھے، اکابر اور اعزہ اُس شہر کے سب ان سے برسر عنایت و امداد تھے۔ علی ابراہیم

خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ مجھ سے ان کو اخلاص اور اتحاد تھا۔ واقعی عزیز اپنے طور کا اُستاد تھا۔ شاید سنہ ۱۲۰۵ بارہ سو پانچ ہجری میں اُسی بلدے کے اندر انتقال کیا۔ اور طبع کو صاحب طبعوں کے حد سے زیادہ پر ملال کیا" دیوان میں اُس صاحب قدرت کے ہر قسم کے اشعار ہیں۔ یہ غزلیں انکی منتخب افکار ہیں ◆

ہنگامۂ پرہیز و ورع اب بسر آیا ۔۔۔ اے بادہ کشاں مژدہ کہ پھر ابر تر آیا
کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے ۔۔۔ شاید تہِ مژگاں کوئی لختِ جگر آیا
غفلت میں کٹی شام جوانی تری صد حیف ۔۔۔ پیری میں تو ٹک چونک کہ وقت سحر آیا

وله

ترے حضور میں جب قصد عرضِ حال کیا ۔۔۔ ہجومِ گریہ نے میری زباں کو لال کیا
میں داغ تازہ میں توڑے یہاں تلک ناخن ۔۔۔ کہ ایک بدر کا کاسہ پر از ہلال کیا
ہوا ہے اُس کے گلو میں گرہ دمِ اعجاز ۔۔۔ ترے لبوں نے مسیحا سے کیا سوال کیا

وله

ٹوٹی کمند بخت کا وہ زور رہ گیا ۔۔۔ جب بام دوست ہاتھ سے کچھ دور رہ گیا
اوپر سے زخم گرچہ بھرے ہو چلے ولے ۔۔۔ ناسور تھا جگر میں سو ناسور رہ گیا

وله

مدتوں سے رخنۂ دل یہاں جو مسدود تھا ۔۔۔ ایک ذرا کھولا تو دیکھا خانۂ پُر دود تھا
کبریائی کا جو دیکھا میں نے جس جا ظہور ۔۔۔ اپنی اپنی حد میں جو پیشہ تھا اک نمرود تھا
حالِ قدرت پوچھتا ہی کچھ تو ظالم مجھ سے سُن ۔۔۔ اُس کے بالیں پر دعا کو آج ہی موجود تھا
آہ جو اُٹھتی تھی درد دل سے تھی لپٹی ہوئی ۔۔۔ اشک جو گرتا تھا سو لختِ جگر آلود تھا

وله

بیتابیوں سے یہ دلِ بیتاب رہ گیا ۔۔۔ اپنی طپش میں جل کے یہ سیماب رہ گیا
آنسو تھمے ہیں پر نہیں سوکھی ہے چشم تر ۔۔۔ دریا اُتر گیا ہے یہ گرداب رہ گیا

وله

ہم پہ ایامِ مصیبت آج پھر آنے لگا ۔۔۔ یار گھر جانے لگا ہای وائے گھر جانے لگا
جب مسیحا دشمنِ جاں ہوں تو کب ہو زندگی ۔۔۔ کون رہ تبلا سکے جب خضر بہکانے لگا
مجھ کو غفلت نے خبر ایام فرصت کی نہ دی ۔۔۔ آہ جب جاتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا

کب تلک ای نالہ زیر لب رہیں گا تو گرہ		حوصلہ باقی نہیں بس جی تو گھبرانے لگا
دل سدا سینہ میں جلتا ہی رہا	ولہ	لختِ دل آنکھوں سے ڈھلتا ہی رہا
تونے گو مجھ کو دلاسے میں رکھا		جی مرا تو بھی تو گھلتا ہی رہا
دل ہوا اسیر زلفِ سیہ فام رہ گیا	ولہ	صیدِ ضعیف مر کے تہِ دام رہ گیا
جب دیکھتا ہی مجھ کو تو دیتا ہی گالیاں		اپنے نصیب کا یہ اک انعام رہ گیا
آگے نہ چل سکا تری کوچے کو چھوڑ کر		خورشید جا کے تا بہ لبِ بام رہ گیا
قدرت کس آ کے یہ کٹی گی یہ زندگی		آنے سے اب تو نام و پیغام رہ گیا
آتش فروز دل ہی تا حسن شعلہ رو کا	ولہ	ہر اشک ہی شرارہ ہر آہ ہے بھبوکا
ڈھونڈھے ہی پاس اب کیا سینہ میں غمزوں کے		مدت سے لٹ چکا یہاں سامان آرزو کا
کشتہ ہوں جان و دل تیرے خدنگ کا میں		خنجر کہاں ہیں ہیگا پیاسا مرے لہو کا
تشنہ لب مرتا ہی بت موجِ دمِ شمشیر کا	ولہ	اے غرورِ ناز کچھ بھی فکر اس نخچیر کا
خواب غفلت لگ گئی تھی ان دنوں دل کو ابھی		آہ پھر کس نے یہ چھیڑا سلسلہ زنجیر کا
رنگِ خونِ تشنگاں جس جا سے اڑ سکتا نہیں	ولہ	ہوں اسیر ناتواں اس خاکِ دامنگیر کا
گھر سے جس وقت وہ غارت گرِ ایماں نکلا	ولہ	کفر سے گبر گیا دیں سے مسلماں نکلا
وہ دل جمع کر اٹھا جو بغل سے اپنی ؏		تو بزیرِ شکنِ زلف پریشاں نکلا
اس چشم سے ہو کے آب نکلا	ولہ	سینہ سے دلِ خراب نکلا
جو نالہ جگر سے پار نکلا		لے سیخ پر اک کباب نکلا
خط آیا وے ہمارے خط کا		منہ سے نہ ترے جواب نکلا
بیت الحزن میں شب کہ ترا انتظار تھا	ولہ	کھٹکا ہر ایک دل کا مرے جی کے پار تھا
ادھر بھی ایک بار جفا کی عناں کو پھیر		دل ہی خدنگ دوست جگر ہی سناں طلب
دست بردِ ظلم سی تیرے ہیں جتنے ہم خراب	ولہ	اس قدر بھی ہو وے گا عالم میں کوئی کم خراب

زخم سے دل کے ابھی اے چارہ گر بہتا ہی خوں — مت ڈبو بے فائدہ پھائے نہ کر مرہم خراب

کھڑے رونا کھڑے سر کو پٹکنا — ولہ — خوشا ایام اوقاتِ محبت

ہرزہ گردی سے رہائی کے چھٹرا — ولہ — پھر مجھے زنداں میں اسے زنجیر کھینچ

جان ہے وابستہ اُس پیکاں کے ساتھ — میرے پہلو سے نہ اپنا تیر کھینچ

ذرا قفس سے قفس تو ملا کے رکھ صیاد — ولہ — کہ تا اسیر کریں مل کے ایک جا فریاد

جہاں نظر پڑے پاؤں تلے ملے کاغذ — ولہ — سمجھ کے نامہ مرا ہاتھ میں نہ لے کاغذ

میں کیونکہ اُس کو لکھوں خط جب اشک و آہ سے یہاں — ادھر چلے قدم اور اُس طرف گلے کاغذ

کسے جز خون دِل میخانہ میں منظور ہی ساغر — ولہ — مری آنکھوں میں تجھ بن دیدۂ ناسور ہی ساغر

آہ روے پاک تیرا کس طرح آوے نظر — ولہ — لختِ دل جب چھا رہا ہو دیدۂ نمناک پر

یہ دلِ شوریدہ جیسے ساتھ ہی زیرِ زمیں — شور محشر ہی رہا قدرت کی مشت خاک پر

تجلی جلوہ چاہے تو صفائے سینہ پیدا کر — ولہ — اگر دیدار کا طالب ہے تو آئینہ پیدا کر

ہے نالۂ شام آتش و آہِ سحر آتش — ولہ — کیا زیست ہو اپنی اِدھر آتش اُدھر آتش

جز داغ تدارک نہیں اس داغ جگر کا — آتش کے جلے کو نہ کرے یہ جگر آتش

پھاہی کو اگر داغ سی چھاتی کے چھڑا دوں — خاشاک کے پہلو میں چھپے آن کر آتش

چل بسے دنیا سے بن دیکھے ترا دیدار حیف — ولہ — لے چلے حسرت بھرا یہاں سی دلِ افگار حیف

جرم پر تیری محبت کے ہمیں کرتے ہیں قتل — حفظ جاں کے واسطے گر کیجئے انکار حیف

مرگ پہلی ہی جب تلک آئے فراق — ولہ — ورنہ کیا جانوں کہ سر پر کیا بلا لاتی فراق

زخم پہلو نے نہ پائی آہ دل ناکام تک — ولہ — حیف پہنچا ہی نہ اپنا کار شوق انجام تک

صبح کے ہوتے ہی ہو جس کی یہ حالت تباہ — آہ وہ بیچارہ پھر جیوے گا کیونکر شام تک

کر چکا ہے کام اپنا یہاں تو درد انتظار — جب تلک پہنچی ہی قاصد اُس بت خود کام تک

ہم نہ کہتے تھے کہ قدرت مت چمن کی راہ چل — لے گئی آخر ہوائے گل شکنج دام تک

رنگ کچھ اور ہی بدلتا ہے مرا ہیتا سب دل
گرسے بھتے آکے اس در پر سمجھ کر اپنا مامن ہم
ہوا یوں پھر گئی اس بزم کی اپنے نصیبوں سے
شب ہجراں کو قدرت اس طرح ہم روز کرتے ہیں
جوں نقشِ قدم ہیں ترے وے خاک نشیں ہم
نسبت ہے، ہماری تری جوں سایۂ و خورشید
گئے وہ دن کہ پلک مارتے یاں دریا بہے
تیرے جاں سوختہ خورشید قیامت کے تئیں
بھیج مت مرہم کافور تو قدرت کے حضور
ابرو ترے کہتے ہیں کہ ہیں تیغ دو سر ہوں
شایستۂ دنیا نہ سزاوار ہوں دیں کا
دل سے کہا ساں نے کہ سینہ میں یاں رہوں
قدرت بزیر خاک بھی آرام کب ملے
آگ اس داغ کو لگیو کہ نمک سود نہیں
مرحبا آتش دوری کہ جلایا ایسا
زخم پر زخم لگے تب ہو تسلّی دل کی
شام کو دھوتا ہوں سو خون جگر سے آستیں
تو بھی کم ابر بہاری سے نہیں اے چشم تر
لختِ دل اور اشک ہرگز خاک پر گرنے نہ دے
جنوں تیرے ناخن مگر گھس گئے ہیں
سپٹکنے لگے اشک گلگوں مژہ سے

ولہ ہے گھڑی آتش کا پرکالہ گھڑی سیماب دل
ولہ اگر تو ہے نہیں راضی تو جاویں آہ کس کن ہم
گنے جاتے ہیں اور سب دوست تیرے ایک دشمن ہم
کبھی سر کو پٹکتے ہیں کبھی کرتے ہیں شیون ہم
ولہ تا مت نہ چکیں آپ سے چھوڑیں نہ زمیں ہم
جس جا نہیں تو ہم ہیں جہاں تو ہی نہیں ہم
ولہ اب بصد خون جگر چشم کو تر کرتے ہیں
ہر سحر پنبۂ ناسور جگر کرتے ہیں
یہ علاج اور ہی زخموں پہ اثر کرتے ہیں
ولہ عاشق کا یہ دعویٰ ہے کہ ہیں سینہ سپر ہوں
ای وائے میں قدرت نہ اِدھر ہوں نہ اُدھر ہوں
ولہ ناوک یہ پوچھتی ہے بھلا میں کہاں رہوں
یہ درد و داغ ساتھ ہے میرے کہ جہاں رہوں
ولہ پھوٹے وہ آنکھ جو لخت جگر آلود نہیں
جل بجھے سر سے لے پاؤں تلک اور دود نہیں
حوصلے پر مرے اک زخم کچھ افزود نہیں
ولہ صبح خون آلودہ ہے پھر چشم تر سے آستیں
کردے اب رشکِ چمن خونِ جگر سے آستیں
بھرلے ای قدرت تو اس لعل و گہر سے آستیں
ولہ کہ عقدہ پڑا ہے بکارِ گریباں
پھر آئی ہے فصل بکارِ گریباں

قافلہ کے قافلے اس راہ میں جوں نقشِ قدم	وله	ہو گئے پامال تیرے حسرت پابوس میں
بہ نہ کر مرہم سے داغِ سینۂ پر نور کو	وله	کوئی بجھاتا ہے ارے ظالم چراغِ نور کو
داغ نے دل کو مرے تنہا نہ چھوڑا ایک دم		زخمِ سینہ سے سدا اُلفت رہی ناسور کو
تب مزا دیوے گا قدرت زخمِ سینہ پر نمک		دے سر ناخن سے پہلے آشتی انگور کو
نہ جا اس بزم سے ہرگز جھٹک مت طرف داماں کو	وله	نہ دے برباد اے ظالم غبارِ خاکساراں کو
ہوا دستِ جنوں سے تار تار از بسکہ پیراہن		گریباں ڈھونڈھے ہے دامن کو اور دامن گریباں کو

تم نے تو منہ چھپایا اُس زلفِ عنبریں میں	وله	یہ شامِ غم ہماری اب کس طرح سحر ہو
میں رکھا ہے ابروِ کماں کے نشاں کو	وله	ہما چھیڑیو مت مرے استخواں کو
گلو گیر ہے یہاں تلک ناتوانی		کہ سینہ سے لب تک نہیں رہ فغاں کو
اُڑائی ز بس خاک ماتم میں دل کے		کیا ہم نے آخر زمیں آسماں کو
نوح کشتی سے خبردار کہ یاں چھائی تبھی	وله	مرہمِ تازہ ناسورِ کہن چھوٹے ہے
کس کی نیرنگی یہ برقِ خاطرِ مایوس ہے	وله	جو شرر دل سے اُٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یہاں سے کر گئی		اب وہ داغِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے	قطعه	کیا ہی ملکِ روم و کیا ہی سرزمین روس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے		چل دکھاؤں تو کہ قیدِ آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف		جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے کہ یہ		یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حشمتِ دنیا سے آج		کچھ بھی ان کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے
کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھی تسبیح ریا		آج رہنِ جامِ مے پھر خرقۂ سالوس ہے
سینہ اُس کا ہے دل اُس کا ہے جگر اُس کا ہے	وله	تیرِ بیداد جدھر رخ کرے گھر اُس کا ہے
اس گلی سے جو کوئی گذرے ہے سو جی سے گذرے		دیکھ اُس راہ نہ چل راہ گذر اُس کا ہے

لخت دل نوک مژہ پر نہ سمجھ اے ہمدم
تخم غم دل میں جو بویا تھا ثمر اُس کا ہے

ولہ
نہ تھی تاب نگہ جب لگ گیا وہ دور آنکھوں سے
نہ ہونا چشم کا بہتر تھا ایسی کور آنکھوں سے

جہاں جاوے وہ نور دیدہ آنکھوں کے مقابل ہی
جدا ہوتے نہیں جاوے نگہ کو دور آنکھوں سے

زباں قدرت کی ضعف ہجر سے ازبس ہے لکنت میں
اشارت بات کی کرتا ہے جوں رنجور آنکھوں سے

ولہ
کر اقلیم قناعت کا سفر تا تجھ پہ روشن ہو
کہ چشم مور سے بھی تنگ تر ملک سلیماں ہے

لب قدرت سے جز فریاد کچھ ریزش نہیں کرتا
یہ کچھ شاعر نہیں ہے اپنے دل کا مرثیہ خواں ہے

ولہ
نہ واقف کارواں سے ہوں نہ کچھ آگاہ منزل سے
گیا میں وادی اُلفت کو طے اک جنبش دل سے

گئے وے دن کہ بہتے تھے پڑے نالے ان آنکھوں سے
سر مژگاں تلک اک اشک اب آتا ہے مشکل سے

کرے تو ذبح جب تک اور کو یہ مفت مرتا ہے
نہ ہو غافل ارے صیاد صید نیم بسمل سے

ولہ
غنیمت بوجھ ملنے کو کہ یہ عالم اک افسوں ہے
کدھر فرہاد شیریں ہے کدھر لیلی و مجنوں ہے

تو کیا ساماں پوچھے ہے کہ تجھ بن کیونکہ گذری ہے
یہ سر ہے اور زانو آستیں اور چشم پُر خوں ہے

ولہ
آساں نہ کٹے گی یہ جدائی کی جو شب ہے
مشکل ہے قیامت ہے مصیبت ہے غضب ہے

ولہ
دل پُر داغ ہے اور حسرت پابوسی ہے
دست اُمید ہے اور دامن مایوسی ہے

دل گم گشتہ خبردار کہ یاں سینہ میں
تیر بیداد سدا اور پئے جاسوسی ہے

دم جاں بخش کی اُس کے جو پڑی ہے یہ دھوم
لب عیسیٰ نے مگر تیری زباں چوسی ہے

ولہ
جس جگہ جلوہ ترا مایۂ مدہوشی ہے
یاد میں اپنے اگر ہے تو فراموشی ہے

آہ یہ کون سی منزل ہے کہ رکھتے ہی قدم
نقش پا سے مرے سجدہ کو ہم آغوشی ہے

ولہ
سرگشتہ ترے لئے جہاں ہے
اے خانہ خراب تو کہاں ہے

جو زخم کہ ہو چکے نہ ناسور
وہ زخم نہیں وبال جاں ہے

قدرت ٹک کھول چشم عبرت
گر فکر سراغ رفتگاں ہے

جز نقش قدم ہے اس زمیں پر
آئینۂ حال رہرواں ہے

اشک اب آنے ستی کچھ تھم رہے	وله	لخت دل مژگاں پہ شاید جم رہے
ابتو اس منزل سے نہیں اُٹھتے قدم		ہمرہاں آگے چلو تم ہم رہے
ہر آن اک ستم ہے ہر لحظہ اک جفا ہے	وله	کوچہ ترا ہے ظالم یا دشت کربلا ہے
ملتا نہیں کسی سے اس پر ہی کیا مصیبت		یارب یہ دل ہمارا کس سے جدا ہوا ہے
ہو گرد باد جیدھر ہم کو اُدھر ہے جانا	وله	صحرا میں گمرہوں کا یہ خضر رہنما ہے

باب الکاف

۱- کلیم

کلیم تخلص، شیخ محمد حسین نام۔ شاہ جہان آبادی۔ مشہور سخنور ہے دلّی کا، اور قرابتیوں میں میر تقی میر تخلص کے تھا۔ ایک رسالہ عروض وقافیہ کا اس نے زبان ریختہ میں لکھا ہے، اور خصوص الحکم کا ترجمہ بھی زبان ہندی میں کیا ہے۔ ایک نثر اور بھی رنگین زبان ریختہ میں ریختۂ قلم معنی رقم رکھتا ہے۔ لیکن باوصف اس خوش گوئی کے کلام مشہور بہت کم رکھتا ہے۔ عہد دولت میں احمد شاہ بن فردوس آرامگاہ کے ایام اس کے شعر و شاعری کا تھا، اور زمزمہ پردازان شاہ جہان آباد کے ساتھ ہم صفیر و ہم نوا تھا۔ چنانچہ دلّی ہی میں اس خرابۂ دار فانی سے گذرا، اور مقیم بیت المعمور کاشانۂ باقی کا ہوا۔ صاحب دیوان اور شاعر شیریں بیان تھا۔ یہ اُس کلیم طور سخندانی کے کلام سے ہے:

گو روضۂ رضواں کو میں اک آن میں دیکھا	وله	جب گل کی طرح جھانک گریباں میں دیکھا
لگتی ہو اب تو قلقل مینا سے دل کو ٹھیس	وله	وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا
قبر میں بھی لئے ہمراہ گیا اپنے کلیم	وله	آہ کیوں درد دل اپنا نہ کسی کو سونپا
رکھتا ہے زلف یار کا کوچہ ہزار پیچ	وله	اے دل سمجھ کے جائیو ہے راہ مار پیچ
ہو چکا حشر گئی دوزخ و جنت کو خلق	وله	رہ گیا میں ترے کوچے میں گرفتار ہنوز

پوچھ مت غم کی داستاں اے دل	ولہ	گر پڑا ٹوٹ آسماں اے دل
پیری کی بھی سیر کر گئے ہم	ولہ	اس پل سے بھی بس گذر گئے ہم
واں غصہ ہوئے رقیب پر تم		ہاں مارے ادب کے مر گئے ہم
بات اس کی زبان پر آئی	ولہ	پھر خرابی جہان پر آئی
غرورِ حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہنچے	ولہ	غرض ہم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے
اس کے ابرو کی اگر تصویر کھینچا چاہئے	ولہ	اوّل اپنے قتل پر شمشیر کھینچا چاہئے
عرق ہے منہ پہ ترے یا گلاب ٹپکے ہے	ولہ	عجب ہے مجھ کو کہ شعلہ سے آب ٹپکے ہے
مجھے میں آنکھوں میں کیونکر رکھوں کہ ہے برسات		پھر ایسا گھر کہ یہ خانہ خراب ٹپکے ہے
گلرو تو چمن میں اچپلی سے نہ گیا	رباعی	یہ دل بھی کلی سے بے کلی سے نہ گیا
جو کوئی گیا دل کو گیا چھوڑ یہاں		دل سے تو کوئی تیری گلی سے نہ گیا
دنیا کے ہاتھ سے جو دل ریش ہیں ہم	رباعی	اس واسطے یاں عاقبت اندیش ہیں ہم
دنیا داری و نوکری محنت و کسب		جب کچھ نہ بنا کہا کہ درویش ہیں ہم

باب اللام

۱۔ لطف

لطف تخلص میرزا علی نام۔ راقم ہے اس چند اوراق پریشان کا، کہ مانند نامۂ اعمال اپنے کے سیاہ کئے۔ اور اسمِ گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے متوطن استرآباد شجاعت بنیاد کے ہیں۔ سنہ ۱۱۵۵ گیارہ سو پچپن ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہ جہان آباد میں تشریف لائے اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے، کہ آپس میں معرفت ولایت کی تھی، مصدر عنایات بادشاہی ہوئے۔ آگے بیان امورات دنیوی باعث ہے طول کلام کا، اور وہ معاملہ دیکھا ہوا ہے ص

وعام کا۔ بہر حال غزل فارسی کے کہنے میں حضرت کو ید طولیٰ تھا، اور ہجری تخلص آپ کا تھا۔ اس تذکرے میں اشعار ہندی کا التزام ہے، اس سبب سے یہاں لکھا نہیں گیا آپ کا کلام ہے۔ اصلاح فارسی کی اس ہیچمدان کو آپ ہی کی جناب سے ہے، اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے۔ یہ خذف ریزے کتنی ایک کہ سراب گاہ طبع ناقص کے فراہم ہوئے تھے، عرضِ خدمت ارباب معنی کے کئے جاتے ہیں *

پاس ناموسِ محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع ساں سوزِ شبِ ہجراں زباں پر لائیں کیا

بلبل و گل ہیں وہ جوشش سرو قمری میں یہ ربط
گلستانِ دہر میں پھر دل کو تئیں الجھائیں کیا

غیر لبریز شکایت ہے مری جان سے آج
سن کے میرے قدرداں اب دیکھیے فرمائیں کیا

چمن کو گل جو تری مے کشی کا دھیان آیا
ہر ایک پات کے کھڑکے پہ گل کا کان رہا

رہا جو زندہ شبِ تیرۂ فراق میں قیس
سیاہ خیمۂ لیلیٰ کا اس کو دھیان رہا

جو عمر خضر ہو شاید تو وصل ہووے نصیب
یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا

نہ آنکھ بھر کے کبھو ڈر سے ہم تو دیکھ سکے
وہ سامنے بھی اگر اپنے ایک آن رہا

نہ کر اے بلبل دل سوختہ صیاد کا شکوا
کہ جاں بازوں کو دیں میں کفر ہی جلاد کا شکوا

نہیں شیریں پہ کچھ موقوف یہ قسمت کی خوبی ہے
زبانِ تیشہ سے کوئی سنے فرہاد کا شکوا

میں اپنے سرو قامت سے ہی کیا شاکی تھا گلشن میں
تسلی ہو گئی قمری سے سن شمشاد کا شکوا

نہ تنہا میں ہی اپنی خانہ ویرانی کا شاکی ہوں
کرے ہی اک جہاں اس خانماں آباد کا شکوا

ترے کانوں تلک بھی لطف کچھ آواز آتا ہے
ہے اک عالم کو تیرے نالہ و فریاد کا شکوا

ولہ

ایک دن حال دل زار نہ دیکھا نہ سنا
سچ تو یہ تجھ سا بھی دلدار نہ دیکھا نہ سنا

دیکھ کل نبض مری رو کے لگا کہنے طبیب
کبھی میں نے تو یہ آزار نہ دیکھا نہ سنا

وہ مجھے تم نے دکھایا ہی کہ یعقوب نے جو
کبھی اے دیدۂ خونبار نہ دیکھا نہ سنا

لخت دل کرتا ہی کیا کیا صفِ مژگاں پہ نمود
اس جواں سا بھی نمودار نہ دیکھا نہ سنا

چشم اور گوش زمانہ ہیں مقر اُس کی لُطف
ہے اُس شدت سی رنگینیٔ کوئے یار کا چرچا
ڈھکا رہ جائے اسرارِ محبّت تو غنیمت ہی
برنگِ پیکرِ تصویر رہتا ہوں سدا ساکت
ہمیں ہی یار کی چرچے سے یہ فرصت کہاں ہم
بیانِ دردِ دل کس لُطف سے کرتے ہزار افسوس
زہے غفلت کہ ہم دنیا کو بزمِ عیش سمجھے تھے
نہ کر اے لُطف ناحق رہروانِ دہر سی حجّت
ازبس نہ ہوا ہم سے سرانجامِ محبّت
فرہاد سا نہ رنگ نہ مجنوں سا کیا حال
کیونکر نہ بھلا ہمدم ہو زندگی اب مشکل
اک آہ کے کرنے کو سو چاہئیں تمہیدیں
وہ لاکھ بہانے ہوں نت روئے وہ آنسو
یاروں نے یہ تو کہو کیا کیا سجھائیاں ہیں
میں کیا ہوں باختہ رنگ اُس شعلہ رو کی آگی
اک جوئے شیر بدلے اے آفریں ہی فرہاد
کب غنچۂ دل اپنا واشد صبا ہو تجھ سے
طاقت حباب سیاں اک نظّارہ کی بلی ہے
کعبے سے ہم نہ واقف نہ بتکدہ سی آگاہ
اُس قد کا سرو سی ذکر چھوٹا منہ اور بڑی بات
ای لُطف اس غزل پر کہنا بقول سودا

ثانیِ حیدرِ کرّار نہ دیکھا نہ سُنا
ولہ کہ بھولا عندلیبوں کو گُل گلزار کا چرچا
ہوا ہے اب حکیموں میں مری آزار کا چرچا
ہی اس پر اُس کی محفل میں مری گفتار کا چرچا
کہ اب دن رات بیٹھے کیجئے اغیار کا چرچا
جو ہوتا بزم میں اُس کی کبھی اشعار کا چرچا
کھُلی چشمِ حقیقت میں تو کامِ اژدہا نکلا
یہی رستہ تو کھا کر پھیر سے کعبہ کو جا نکلا
ولہ شرماتا ہے دل لیتے ہوئے نامِ محبّت
کس منہ سے اُسے بھیجئے پیغامِ محبت
ولہ ہیں دل میں تو سو باتیں اور جنبشِ لب مشکل
کس سی کہیں حالِ دل ہی آہ عجب مشکل
دو دن کا ہوا جینا ہم کو تو غضب مشکل
ولہ بے وجہ کچھ نہیں یہ ہم سے رکھائیاں ہیں
مہتاب کے بھی منہ پر چھٹتی ہوائیاں ہیں
کیا بے ستوں میں خوں کی نہریں بہائیاں ہیں
گو سیکڑوں گلوں کی عقدہ کشائیاں ہیں
ان فرصتوں پہ ظالم یہ خود نمائیاں ہیں
یہاں آستانِ دل ہی اور جبہ سائیاں ہیں
غنچہ کی دل میں بے ڈھب باتیں سمائیاں ہیں
یہ عاشقی نہیں ہی زور آزمائیاں ہیں

او میاں تیغ والے اور اک زخم
کب سے ہم ایڑیاں رگڑتے ہیں
برگِ گل جس نمط خزاں میں جھڑیں
لختِ دل یوں مژہ سے جھڑتے ہیں
بس غمِ یار اب نبڑ جا جلدی
ورنہ اب یار ہی نبڑتے ہیں

ولہ

تم ہو بزمِ عیش سے وہاں اور صحبت داریاں
ہم ہیں کنجِ غم میں یہاں اور جان سی بیزاریاں
تم کو سیرِ باغ و گلگشتِ چمن کا وہاں ہے شوق
یاں بدن پر ہے ہجومِ داغ سے گلکاریاں
دھیان ہے آرایشِ زلفِ پریشاں کا تمہیں
یاد ہیں حالِ پریشاں کی مرے کچھ خواریاں
تم صفاء ساعد و بازو دکھاتے ہو وہاں
ہم پہ یہاں موئے بدن کرتے ہیں نشتر زاریاں
تم نے دکھلائی وہاں پیٹ اور چوٹی کی پھبن
یاں مری چھاتی پہ ہیں کالے سے لہریں ماریاں
نیک و بد دونوں سے یہاں ہم نے تو آنکھیں موند لیں
تم وہاں چتون کی دکھلاتے ہو جادوگاریاں
یہاں برنگِ پیکرِ تصویر ہم خاموش ہیں
گفتگو کی تم دکھاتے ہو وہاں طرّاریاں
قہقہے تم مارتے ہو وہاں بآوازِ بلند
دشمنوں سے یہاں چھپا کر ہم ہیں کرتے زاریاں
ہر مریضِ غم کی جان بخشی کا ہے تم کو دھیان
کھنچ گئیں یاں طول شدت سے مری بیماریاں
اضطرابِ دل سے بے پردہ ہوا یہاں رازِ عشق
سوجھتی ہیں وہاں تمہیں ہر بات میں تہ داریاں
کیا کسی سے بات کیجے بھولتے اک دم نہیں
اُن بھلاؤں سے وہ باتوں میں تری عیّاریاں

ولہ

نہیں یہ شیشہ مت ای محتسب مچا دھو میں
دھرا ہے آبلۂ دل ہمارے پہلو میں
کب اپنی چشم میں طوفانِ نوح کو ہو قدر
نہاں ہے یہاں وہی عالم ہر ایک آنسو میں
اگرچہ فرق زمیں آسماں کا ہے تاہم
ملے ہے وضع فلک کی بہت تری خو میں

ولہ

غبارِ بیکسی سے کیا ضرر پاکیزہ جوہر کو
کرے تختے شب ہے جلا گردِ یتیمی آبِ گوہر کو
گذر جا سر سے مانندِ قلم گر ہے سرِ شاہی
نہ آساں سمجھیو پانا سنیہ بختیِ افسر کو
کبھی تو خاکساروں کا بھی غم خانہ کرو روشن
نہیں گو کچھ بھی نقشِ بوریا تو ہوگا بستر کو
چھلکتا عمر کا اک دم میں پیمانہ ہے ای ساقی
وفا دشمن شتابی کر ذرا لبریز ساغر کو

پھرا مجنوں کا دل سنگِ ملامت سی نہ مرتی تک   بڑا ہی چاہیئے بحرِ جنوں میں بار لنگر کو
کیا ہم نے تو ترک مدعا کو مدعا اپنا   خدا توفیق بخشے نیک چرخِ سفلہ پرور کو
نہیں معلوم کیا اس سینۂ سوزاں میں پنہاں ہے   ولہ   کہ ہر تارِ نفس جوں رشتۂ شمع آج سوزاں ہے
نہ میں فرہاد ہوں ای عشق نہ مجنونِ دل خستہ   مرا پھر منتظر بتلا تو کیوں کوہ و بیاباں ہی
تری طرزِ سخن پہنچی کہیں اے لطف گلشن میں   نئے انداز سے بلبل چمن میں اب غزل خواں ہے
جس دن سے ہم جنوں کے ہیں داماں لگی ہوئے   ولہ   دامن کی جا یہاں ہیں گریباں لگی ہوئے
اللہ رے قید خانۂ ہستی کہ دم کے ساتھ   ہر اک قدم پہ لاکھوں ہیں زنداں لگی ہوئے
رویا میں دیکھ مرقد مجنوں کو دھاڑ مار   تھے جائے گل درختِ مغیلاں لگی ہوئے
بارے چھٹا اسیرِ بلا اس گلی میں آج   ہیں تو وہ ہائے گنج شہیداں لگے ہوئے
بیمار کا ترے تو کھلا حال بعد مرگ   سینہ میں زخم تھے کئی پنہاں لگی ہوئے
یارانِ پیش رو ذرا ٹھیرو کہ جوں جرس   ہم پیچھے پیچھے آتے ہیں نالاں لگی ہوئے
رکھ سوچ کر قدم مرے وادی میں گردباد   پاؤں سے اپنے ہیں یہ بیاباں لگی ہوئے
کوئی تو میرے ناصح دانا سے یہ کہو   دل چھوٹتے ہیں باتوں میں ناداں لگی ہوئے
کیا دن تھے وہ بھی لطف کہ رہتی تھی مثلِ زلف   کانوں سے اس کی ہم سی پریشاں لگی ہوئے
خورشید کی بھی آنکھ فلک پر جھپک گئی   ولہ   ٹک جو گرہ نقاب کی اس کے سرک گئی
سب کنارہ گیر اپنے اور بیگانے ہوئے   ولہ   اب کی فصلِ گل میں ہم بے طرح دیوانے ہوئے
شہر میں پایا نہ تیرے جور نے شہرا کہ اب   گھر بہ گھر ظالم مرے مذکور افسانے ہوئے
بزم میں آیا جو شب وہ گل رخِ خوں شمع سے   بلبلوں کی طرح جی دینے کو پروانے ہوئے
سنتے ہیں کی محتسب نے بیعتِ دستِ سبو   مژدہ مے نوشاں کہ پھر آباد مے خانے ہوئے
تو تو کس کا آشنا ہے ہاں مگر کہنے کو ہم   آشنا ہو تجھ سے اک عالم سی بیگانے ہوئے
روشن ضمیر کیونکہ نہ ہوں دل کی داغ سے   ولہ   خورشید کو ہے کسبِ ضیا اس چراغ سے

وہ خود فروش آگیا بارے چمن میں گل
بوئے خودی نکل گئی گل کے دماغ سے

ہو وے فضائے ہستیِ موہوم کا برا
کنجِ عدم میں کاٹتے تھے کس فراغ سے

اُس گلبدن بغیر ہمیں سیر باغ میں
صوتِ ہزار کم نہیں فریاد زاغ سے

جس دل زدے کو نغمۂ بلبل ہو بانگِ زاغ
کیا خاک وہ شگفتہ ہو گلگشت باغ سے

وله

دیکھنا جن صورتوں کا شکل تھی آرام کی
اُن سے ہیں مسدود راہیں نامہ و پیغام کی

رخصت ای اہل وطن اب ہم ہیں اور آوارگی
حق رکھے بنیاد قایم گردشِ ایام کی

یاد نے اُن تنگ کوچوں کی فضا صحرا کی دیکھ
ہر قدم پر جان ماری ہے دل ناکام کی

گردشِ چشم بتاں کے بسکہ ساغر نوش تھے
گردشِ گردوں کو ہم کہتے تھے گردش جام کی

جب سے کھینچا لطف رنج فرقتِ یار و دیار
اب ہوئی معلوم محنت گردش ایام کی

کیوں دل پہ مرے جادو اُن آنکھوں کا نہ ٹھن جائے
جس پر کہ پڑے آنکھ سو دیوانہ سا بن جائے

پلکیں وہ نکیلیں کہ نظر جب پڑے اُن پر
سینہ میں یہ عالم ہو کلیجہ کا کہ چھن جائے

بے چین بہت لطف کی ہے کل سے طبیعت
اللہ کرے آج وہ روٹھا ہوا من جائے

وله

کیا سبب بتلائیں ہنستے ہنستے باہم رک گئے
خود بخود کچھ وہ کھچے اودھر اِدھر ہم رک گئے

دیر تک ضبطِ سخن کل اُس میں اور ہم میں رہا
بول اُٹھے گھبرا کے جب آخر کے تیئں دم رک گئے

وله

اِدھر سے جتنی یگانگت کی اُدھر سے اُتنی ہوئی جدائی
بڑھائی تھوڑی سی جب اِدھر سے بہت سی تم نے اودھر گھٹائی

نہ ہم سے بگڑو نباہ دو جی نہیں ہے کچھ تم کو دھیان اس کا
کہے گی خلقت کہ ہو چکی بس وہ دیکھو دو دن کی آشنائی

رباعی

جنت ہے کہے بزم مری بو دیکھو
یوں جام کہے جم سے کہ مجھ کو دیکھو
ہر آئینہ آئینہ محل کا تیرے
کہتا ہے سکندر سے کہ منہ تو دیکھو

رباعی

منہ رکھتے ہیں کیا صاحب تاج و دیہیم
جو خاک نشینوں کے تئیں جانے سقیم
ہم آنکھ اُٹھا دیکھیں نہ گردوں کی طرف
گر خم نہ ہو ماہ نو برائے تعظیم

بابُ المیم

امیر

میر تخلص، نام نامی اُس نگین خاتم سخن آفرینی کا میر محمد تقی ہے۔ متوطن اکبر آباد کے سراج الدین علی خاں آرزو تخلص آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دور کے تھے۔ ابتدائے سن شعور سے پرورش انہوں نے دار الخلافہ شاہ جہان آباد میں پائی ہے، اور خان مذکور کے فیض صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اُٹھائی ہے۔ تازگی مضمون کی اور علو معانی کا بیان سے ان کے ظاہر ہے، فی الحقیقت کہ شاعر مذکور لطافتوں سے ریختہ کی بخوبی ماہر ہے۔ جو شخص کہ نظارہ گاہِ سخن میں چشم خوردہ بیں رکھتا ہے، اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے۔ تو وہ اس بات کو جانتا ہے، اور اس رمز کو پہچانتا ہے، کہ میر شیریں مقال ہیں، اور ریختہ گویان سابق و حال میں، نسبت خورشید و ماہ ہے، اور فرق سفید و سیاہ ہے، بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا، تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا۔ غرض اس تردد سے زبان قلم کی، اور اس خراش سے عارض رقم کی، مراد یہ ہے کہ ناقدردانی سے اغنیا کی، اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوا، شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاریِ سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرواز ہے مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے۔ جس ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زبان دانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتے سے لکھنؤ کو گئی، تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی، لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے، اور جوانان نومشق مربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔

زمانہ خوش طبیعتوں سے کبھی نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست حمالی ہے، کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہل تمیز ہیں، کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے

نوجوان غور کیے میں ہوید ہیں۔ اب بھی جو بوجہ تمکنتِ معنی کا جرِ ثقیل طبع سے ترازو کر کے وہ دکھلاتا ہے، جوان اگر کوہ بو قبیس ہے تو تحمل سے اُس کے کمر چراتا ہے۔ بہر تقدیر غرض جب میرزا محمد رفیع سودا بلدۂ لکھنؤ میں اس دارِ فانی سے عالمِ باقی کو سدھارے، تو میر مذکور شاہ جہان آباد میں تھے سنہ ۱۱۹۷ گیارہ سو ستانوے ہجری میں رایاتِ عزم اس صاحبِ لشکرِ مضامینِ تازہ کے حرکت میں آئے، اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے روزِ ملازمت خلعتِ فاخرہ دیا، اور تین سو روپے مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کیا۔ اگرچہ کج مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نوابِ مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا۔ اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہدِ وزارت میں آج کے دن تک، کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، وہی حال ہے، جو اوپر مذکور ہوا۔ اقسامِ نظم میں یہ صدر نشین بارگاہِ سخندانی ہر قسم چکیدۂ خامۂ معجز نما رکھتا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظمِ غزل میں ید بیضا رکھتا ہے۔ قصیدہ تو ختم میرزا محمد رفیع سودا پر ہوا، ہاں طرزِ مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے، خصوصاً دریائے عشق، جو ان کی مثنوی ہے، اک جہان کے مرغوب ہے۔ یہ رہنما قومِ سخن سرمایہ گان کا مالک چار کتاب پر دلیل و برہان ہے یعنی صاحبِ چار دیوان، خوش بندش خوش ان ہے۔ مثنویاں بھی متعدد ان سے ثبتِ جریدۂ روزگار ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب ہیں ۔

اس دور میں الٰہی محبت کو کیا ہوا — چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا

امیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے — آتے ہی آتے یار و قیامت کو کیا ہوا

ولہ

چمن میں گل نے جو کل دعوائے جمال کیا — جمالِ یار نے منہ اُس کا خوب لال کیا

بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو — چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے — جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

ولہ

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا — جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

دل کا نہیں ٹھکانا حالت جگر کی گم ہے — تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے — ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

ولہ

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
خراب رہتے تھے مسجد کے آگے بت خانے — نگاہِ مست نے ساقی کے انتقام لیا
وہ کج روش نہ ملا راستے میں ہم سے کبھو — نہ سیدھی طرح سے اُن نے مرا سلام لیا

پیغام غم جگر کا گلزار تک نہ پہنچا — نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہنچا
اُس آئینہ کے مانند زنگار جس کو کھا جائے — کام اپنا اُس کے غم میں دیدار تک نہ پہنچا
لبریز شکوہ تھے ہم لیکن حضور اُس کے — کارِ شکایت اپنا گفتار تک نہ پہنچا
مستوری خوبروئی دونوں نہ جمع ہوویں — خوبی کا کام کس کے اظہار تک نہ پہنچا
یوسف سے لے کے تا گل اور گل سے لے کے تا شمع — یہ حسن کس کو لے کے بازار تک نہ پہنچا

ولہ

گل کو محبوب میں قیاس کیا — فرق نکلا بہت جو پاس کیا
صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی — کیا پتنگے نے التماس کیا

ولہ

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر — اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا
کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر پڑا جو میر — یک سر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسی کا سرِ پر غرور تھا

ولہ

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا — جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

گذرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا — خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا
آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھنا نہیں — مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا
یک قطرہ خوں ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا — قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

ولہ

سر سے باندھا ہی کفن عشق میں تیرے یعنی — جمع ہم نے بھی کیا ہے سر و ساماں یکجا

ولہ

دل پہنچا ہلاکت کو بہت کھینچ کسالا — لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ
گذری ہی لہو وہاں سر ہر خار سے اب تک — جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

دل کے جانے کا نہایت غم رہا		غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی		ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا
تجھ کو میرے حال سے تھی آگہی		نالۂ شب سب کو خبر کر گیا
یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آؤ		نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا
کاوِ سرکشاں جہان میں کھینچا تھا ہم نے میر		پایانِ کار مور کا خاک قدم ہوا
دل و داغ ہے اب کس کو زندگانی کا		جو کچھ کہ یہاں ہے سو افسوس ہی جوانی کا
اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا	ولہ	لہو آتا ہے جب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی گئی خواہش		گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ		بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا
جو یہ دل ہی تو کیا سرانجام ہوگا	ولہ	تہِ خاک بھی خاک آرام ہوگا
سخت کافر تھا جس نے پہلے میر	ولہ	مذہب عشق اختیار کیا
دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا	ولہ	اب جس جگہ کہ داغ ہے واں آگے درد تھا
عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبطِ عشق کے		دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا
خوبی کو اُس کے چہرے کی کب پہنچے آفتاب	ولہ	ہے اس میں اُس میں فرق زمین آسمان کا
کام دل میں مرا تمام کیا		غرض اُس شوخ نے بھی کام کیا
تیرے کوچے کے رہنے والوں نے		یہیں سے کعبہ کو سلام کیا
وصفِ خط و خال میں خوباں کے میر	ولہ	نامہ اعمال سیہ کر گیا
جو اس شور سے میر روتا رہے گا	ولہ	تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں		جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
تو اب گالیاں غیر کو شوق سے دے		ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا
مجھے کام ہر دم ہے رونے سے ناصح		مرے منہ کو کب تک تو دھوتا رہے گا

مرا خوں تجھ پہ خوں ثابت کرے گا
وصیت میر نے مجھ کو بھی کی تھی
کیا بعد مرگ یاد کروں گا وفا تجھے
مغاں مجھ مست بن پھر قلقل مینا نہ ہووے گا
آرام عدم میں نہ تھا ہستی میں نہیں چین
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
کس کا کعبہ کس کا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
شیخ جو ہے مسجد میں بیٹھا رات کو تھا میخانے میں
کاش اب برقع منہ سے اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
یہاں کے سفید و سیہ میں دخل جو ہے سو اتنا ہے

وله کنارے بیٹھ کر ہاتھوں کو دھونا
کہ سب کچھ ہونا اک عاشق نہ ہونا
وله سہتا رہا جفا ہی میں جب تک جیا کیا
مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا
وله معلوم نہیں میرا ارادہ ہے کہاں کا
وله دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
چاہتے ہیں جو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا
کوچے کے تیرے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
جبہ۔ خرقہ۔ کرتا۔ ٹوپی مستی میں انعام کیا
آنکھ موندے پر اپنی ان نے گو دیدار کو عام کیا
رات گو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

زندگانی بھی ایک وقفہ ہے
ضعف یہاں تک کھنچا کہ صورت گر
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
رہ گیا ہاتھ میں قلم لے کر

کام آئے کا نہیں ایک بھی یار آخر کار
مشت خاک اپنی جو پامال ہی یہاں اس پہ نہ جا
میر گم کردہ چمن زمزمہ پرواز ہے ایک
ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ
گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شور جہاں
گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل

وله ہاتھ سے جائے گا سر رشتہ کار آخر کار
سر کو کھینچے گا فلک تک یہ غبار آخر کار
وله جس کی لے دام سے تا گوش گل آواز ہو ایک
ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہو ایک
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
وله اک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

سیر کر عندلیب کا احوال
وله ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں	وله	وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں
بے قراری جو کوئی دیکھے ہی کہتا ہے یہی		کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں
چلا نہ اُٹھ کے وہیں پھر تو چپکے چپکے میر		ابھی میں اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں
ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہو کیا نہیں	وله	تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں
نازِ بتاں اُٹھا چکا دیر کو میر ترک کر		کعبہ میں جا کے بیٹھ میاں تیرا اگر خدا نہیں
گردشِ فلک کی کیا ہی جو دورِ قدح میں ہی		دیتا رہوں گا چرخ مدام آسماں کو میں
عاشق ہی یا مریض سے پوچھو تو میر سے		پاتا ہوں زرد روز بروز اس جواں کو میں
صد تمنا سے یار رکھتے ہیں	وله	تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں
پھیر کرتے ہیں میر صاحب عشق		ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں
دن گذرتا ہی مجھے فکر ہی میں تا کیا ہو	وله	رات جاتی ہی اسی غم میں کہ فردا کیا ہو
خاک میں لوٹوں کہ لوہو میں نہاؤں میں میر		یار مستغنی ہے اُس کو مری پروا کیا ہو
عشق کو نفع نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب	وله	کرے تدبیر جو یہ درد وہ دوا رکھتا ہو
ہائے اسے زخمی شمشیرِ محبت کا جگر		درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو
فقیرانہ آئے صدا کر چلے	وله	میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
یارب کوئی ہو عشق کا بیمار نہ ہووے	وله	مر جائے ولے اُس کو یہ آزار نہ ہووے
زنداں میں پھنسے طوق پڑے قید میں مرجائے		پر دامِ محبت میں گرفتار نہ ہووے
اس واسطے کا پنوں ہوں کہ ہی آہ نپٹ سرد		یہ باؤ کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے
مانگے ہے دعا دیکھ مجھے خلق یہ ظالم		یارب کسی کو اس سے سروکار نہ ہووے
صحرائے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ میر		یہ سیر سرِ کوچہ و بازار نہ ہووے
جو دے آرام ٹک آوارگی میر		تو شامِ غربت اک صبح وطن ہے
عشق میں بے خوف و خطر چاہیے	وله	جان کے دینے کو جگر چاہیے

باقلِ آغوشِ ستم دیدگاں — اشک سا پاکیزہ گہر چاہیئے
شرطِ سلیقہ ہے ہر اک امر میں — عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

وله
نہیں وسواس جی گنوانے کا — ہائے رے ذوق دل لگانے کا
دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھا بہانے کا

وله
اب جو اک حسرتِ جوانی ہے — عمر رفتہ کی یہ نشانی ہے
اُس کی شمشیر تیز ہے ہمدم — مر رہیں گے جو زندگانی ہے
یاں ہوئے میر ہم برابر خاک — وہاں وہی ناز و سرگرانی ہے

وله
ادا کھینچ سکتا ہے بہزاد اُس کی — وے تصویر کھینچے گا یہ ہم نے مانی

وله
گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی — رشک سے جلتے ہیں یوسف کے خریدار کئی

وله
کیا حال بیاں کریئے عجب طرح پڑی ہے — وہ طرح تو نازک ہے کہانی یہ بڑی ہے
کیا فکر کروں میں کہ ٹلے آگے سے گردوں — یہ گاڑی مری راہ میں بے طرح اڑی ہے
ہے چشمکِ انجم طرف اُس مہ کے اشارے — دیکھو تو مری آنکھ کہاں جا کے لڑی ہے
وہ دن گئے جو پہروں لگی رہتی تھیں آنکھیں — اب یہاں ہیں مہلت کوئی پل کوئی گھڑی ہے
ایسا نہ ہوا ہوگا کوئی واقعہ آگے — اک خواہش دل ساتھ مرے جی کے کھڑی ہے
جاتے ہیں چلے متصل آنسو جو ہمارے — ہر تارِ نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے

رباعی
اب عشق میں میر پاؤں دھرتا ہے گا — سب زیست منغص اپنی کرتا ہے گا
یارو چلو سب چل کے اُسے سمجھاویں — افسوس کہ نوجوان مرتا ہے گا

دیگر
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے — ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر — مرمر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

دیگر
اب وقتِ عزیز کو جو یوں کھو دو گے — پھر سوچ کے غفلت کے تئیں رو گے
کیا خوابِ گراں پہ روز و شب مائل ہو — جاگو ٹک میر پھر بہت سوؤ گے

دل غم سے ہوا گداز سارا اللہ	دیگر	غیرت نے ہمیں عشق کی مارا اللہ
ہے نسبتِ خاص تجھ سے ہر ایک تیئیں		کہتے ہیں چنانچہ سب ہمارا اللہ
تسبیح کو مدتوں سنبھالا ہم نے	دیگر	خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے
اب آخرِ عمر میر جی کی خاطر		سجادہ گرو رکھنے نکالا ہم نے

۲ میر مظہر

مظہر تخلص، میرزا مظہر جانِ جاناں کر کے مشہور تھے۔ مشہور سخنوروں میں ولی کے نظم و نثر ریختہ میں نہایت خوش بیان، اور اندازِ گفتگو میں نادر زبان تھے۔ اصل وطن ان کا اکبر آباد ہے، اور دلی ان کے نشو نما کی بنیاد ہے۔ قناعت اور استغنائے طبیعت کے ساتھ مشہور، اور علم و عمل سے فقہ کے معمور تھے۔ حسن پرستی و دل بستگی سے رغبت تمام رکھتے تھے، اور عشق حقیقی و مجازی سے کام۔ انعام اللہ خاں یقین اور فقیہ صاحب درد مند ان کے شاگردانِ رشید سے کہاتے ہیں، اور میر عبدالحی تاباں تخلص بھی علیٰ ہذالقیاس اسی طرح سے گنے جاتے ہیں +

کہتے ہیں کہ ہفتم روز عاشورہ کو لبِ بام یہ اپنے گھر میں سر راہ بیٹھے تھے، اور کوئی سردار روہیلوں کا بھی آیا ہوا تھا واسطے ان کی ملاقات کے، کہ ناگاہ گذر رشدوں کا ان کے زیر بام سے ہوا، اس روہیلے نے کھڑے ہو کر سینہ زنی بھی کی، اور مواقف سلام سے ہوا، اور میرزائے مذکور جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھے رہے، بلکہ متبسم ہو کے فرمانے لگے کہ "بارہ سو برس جس مقدمے کو ہو چکے ہوں ہر سال اُسے زیادہ کرنا کیا بدعت ہے، اور لکڑیوں کو سلام و تسلیم کرنا نہایت عقل کی خفت ہے"۔ یہ گفتگو بجنسہ وہ لوگ جو کہ علم اور رشدوں کے ساتھ تھے اُنھوں نے سُنی، اور تعصب کی مرزائے مذکور کے امام باڑوں میں اور محلوں میں دو تین شب گفتگو رہی۔ آخر شب شہادت کو، کہ عبادت شب دہم عاشورہ سی ہے کوئی شخص ان کے دروازے پر آیا، اور ان کو باہر بلوایا جب باہر آئے تو بے گفتگو ایک چوٹ طپنچے کی نذر کی، اور کام ان کا پورا کر کے ملوہ راہ اپنے گھر کی لی۔ سن بھی ان کا قریب سو برس کے تھا، اور

ایسا زخم کاری کھایا، لیکن استقلال طبیعت سے پھر اپنے تئیں کوٹھے کے اوپر پہنچایا سنہ ۱۱۹۴ھ[۱] گیارہ سو چورانوے ہجری تھے کہ اس روشن ساز مسائل صدیقی نے، اور اس مصقلہ پرواز احکام فاروقی نے اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کے منازل کے طریقت پر کیا۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں +

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا ،	وله	اس قدر جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
نہیں کچھ غم کہ یوں ملتا نہیں پیماں گسل میرا	وله	کہیں روتا ہوں دل کی بیکسی پر ہائے دل میرا
ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار	وله	ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو کیا ہے کام گلشن سے ولیک		جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں کہ آتی ہے بہار
مرتا ہوں میرزا سے گل ہر سحر	وله	سورج کے ہاتھ جو مری دل ملا صبا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دلِ نازک کے تئیں مرے		یہ شیشہ بیچتا ہے کسی میرزا کے ہاتھ
خدا کے واسطے اُن کو نہ ٹوکو ،	وله	یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں سبھے		ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

۳ مضموں

مضمون تخلص، شیخ شرف الدین نام، متوطن باج مؤ کے تھے۔ باج مؤ ایک قصبہ ہے قصبوں میں سے اکبر آباد کے۔ جس ایام میں کہ وطن سے اپنے یہ وارد شاہ جہان آباد میں ہوئے تھے، تو زینت المساجد میں آن کر اُترے تھے۔ طور ان کی بود و باش کا پھر وہیں رہا ہے۔ اور اتفاق اصلاح کا سراج الدین علی خاں آرزو سے ہوا ہے۔ از بسکہ شیخ مذکور علت سے نزلہ کے منہ میں ایک دانت

[۱] کسی نے کیا بے مثل تاریخ آپ کی وفات کی کہی ہے۔ عاش حمیداً مات شہیداً! لطف یہ ہے کہ یہ الفاظ حدیث نبوی کے ہیں ۱۲

نہیں دھرتے تھے، تو خان آرزو انہیں شاعر بیدانہ کہا کرتے تھے۔ ولی میں نظم وجود کو انہوں نے ناموزون بوجھا ہے، اور مضمونِ عالی انہیں سیرِ وجود کا وہیں سوجھا ہے۔ بیشتر حسن ان کے کلام میں ایہام کا ہے۔ یہ منتخب ان کے کلام کا ہے +

افسوس مار جھٹ پٹ دل کو رکھے ہیں اٹکا		کس ساحروں سے سیکھا زلفوں نے تیری لٹکا
خوبوں کو جانتا تھا گرمی کریں گے مجھ سے	ولہ	دل سرد ہو گیا ہے جب سے پڑا ہے پالا
نہیں ہے زاہدوں کو مے ستی کام	ولہ	لکھا ہے اُن کی پیشانی میں سرکا
ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں ای محبوب کیا	ولہ	صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا
کوچے میں بیوفا کے مارے گئے ہیں عاشق	ولہ	نکلا ہے ایک مضموں بھاگوں سے اپنے جینا
ترا مکھ ہے سرچشمۂ آفتاب	ولہ	نہ لاوے تری حُسن کی ماہ تاب
جس طرح سے رہے ہے مال کی اوپر کالا	ولہ	یوں رہی زلف تری مُنہ کے اوپر مار کے پیچ
گر یہی دار ہے کامل کو سر تاج	ولہ	ہوا منصور سے یہ نکتہ حل آج
ایک تو تھا ہی وہ مہ رو خود پسند	ولہ	ہو گیا آرسی کے تئیں دیکھ دو چند
تجھ بن زبس کہ پانی جاری کئے ہیں رو کر	ولہ	چشموں سے میں اب اپنے بیٹھا ہوں ہاتھ دھو کر
تیر مژگاں برستے ہیں مجھ پر	ولہ	آب پیکاں کا اس طرف ہے ڈھال
کیفی ہو کر جو مجھ سے رہا ہے وہ شوخ	ولہ	جو پوچھتا ہوں بات تو کہتا ہے چل بچل
احوال پیش دلبر کچھ مت کہو ہمارا	ولہ	آتا ہے نام میرا سُن کر اُسے پسینا
شرم سے پانی ہو جاویں سب رقیب	ولہ	جو مرا یوسف ملے آ چاہ سے
وہی دلدار خوش آتا ہے جو ہووی بانکا	ولہ	خوب لگتی نہیں وہ تیغ جو خمدار نہیں
کیا ہوا جو خط مرا پڑھتا نہیں	ولہ	جانتا ہے خوب وہ مضمون کو
اُس دہاں بیچ سخن رکھتا ہوں	ولہ	مجھ پہ اس بات کو اثبات کرو
جب سے چاہا ہے ترا چاہ ذقن	ولہ	آب چشموں سے مرے جاری ہے

نظر آتا نہیں وہ ماہ رو کیوں	وله	گذرتا ہے مجھے یہ چاند خالی
چلا کشتی میں جب آگے سے وہ محبوب جاتا ہے	وله	کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے
یہ اشک آنکھوں میں قاصد کس طرح یک دم نہیں تھمتا		دل بیتاب کا شاید لئے مکتوب جاتا ہے
مرے آئینۂ دل سے ترا نقش	وله	جو دیکھا تو کسی صورت نہ جاوے
مضمون تو شکر کر کہ ترا نام سُن رقیب	وله	غصے سے بت سا ہو گیا لیکن جلا تو ہے

۴۹ مخلص

مخلص تخلص، مخلص علی خاں نام، بھانجے نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ کے، ساکن مرشد آباد۔ میر باقر کر کے مشہور تھے۔ جوان خندہ رو اور کشادہ پیشانی، ہمیشہ خوش وقت اور خوش زندگانی بنگالے میں بہت کیفیت کے ساتھ انہوں نے گذری ہے، اوقات بیشتر عیش و کامرانی میں بسر کی ہے، شب و روز عیش و عشرت سے کام تھا، اور رات دن وقفِ احباب گردنِ صراحی اور لبِ جام تھا۔ زبان ریختہ میں انہوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ چنانچہ دیوان بطور اساتذہ ترتیب بھی دیا ہے لیکن کثرتِ عیش سے از بسکہ دھیان رہا کہیں کا کہیں ہے، کلام ان کا خالی لغزش سے نہیں ہے۔ شاید ۱۲۰۷ھ بارہ سو سات ہجری میں بلدۂ مذکور کے اندر دامِ ہستی کی کشاکش سے رہائی پائی ہے، اور سیر چمنستانِ عدم کی عینِ تعیش میں فرمائی ہے۔ یہ اشعار اس ستودہ کردار کے ہیں ۔

مد بسم اللہ ابرو ہے رخِ عنوان کا		حسنِ معنی کیوں نہ مفتوں ہو مرے دیوان کا
اب تک تو اس کو آ کے جفا کار دیکھتا	وله	مرتا ہے کوئی دم میں گرفتار دیکھتا
ہمارے قتل کرنے سے تجھے آرام کیا ہوگا	وله	میاں اس ظلم کا تو ہی سمجھ انجام کیا ہوگا
بدی میں یاں تلک مشہورِ دنیا ہے مرا مخلص		پھر اس بدنام سے آگے کوئی بدنام کیا ہوگا
ہاتھ ملتا ہے کہ میرے دل کے ہوتے حیف ہے	وله	کیوں کف پا ہیں ترے رنگِ حنا سے آشنا

یہ پوچھو خضر اسمٰعیل سے گر تم نہیں واقف	وله	حیاتِ جاوداں بہتر ہے یا سر کو فدا کرنا
ترکِ اُلفت یہ بتوں کی مجھے مقدور نہ تھا	وله	ورنہ کعبہ مرے بت خانہ سے کچھ دور نہ تھا
مخلص کیا دریافت یہ میں سنگ محک سے	وله	جو عیب کسی کا کہے منہ اُس کا ہو کالا
آخر یہ دل ہمارا کچھ داد کو نہ پہنچا	وله	جز نالہ کوئی اُس کی فریاد کو نہ پہنچا
ہو گئے داغ نمک داں مرے ای کان نمک	وله	جب ستی لب کا ترے شور پڑا کان میں آ
اگر یاد کرے بوسے لب کو ترے	وله	نہ ہو مست کو یہ خمارِ شراب
زخمِ دل سینے کو کہتا ہے مرے کام آتا	وله	باقی رہتا جو کوئی تار گریبان کے بیچ
گئے یہ بال و پر برباد صیاد	وله	قفس سے اب نہ کر آزاد صیاد
دیکھیو نرگس نہیں پھولی یہ باغ و دشت میں	وله	دور سے آنکھیں خزاں کی تیش دکھاتی ہے بہار
دل خستہ و سودا زدہ تدبیر ہے نازک	وله	دیوانہ زبردست اور زنجیر ہے نازک
محبت میں تری جا کر پھنسا دل	وله	دریغا ہائے دل وا حسرتا دل
تھی یہ خوشی کہ ہو گا مرے دل کا غم تمام	وله	وہ تو ہوا نہ کم پہ ہوئے ہای ہم تمام
کیوں عبث میں علاج داغ کروں	وله	خانۂ دل کو بے چراغ کروں
کیوں نہ ہر دم مری آنکھوں سے چوے ہائے لہو	وله	داغ ایسا نہیں کوئی دل میں کہ ناسور نہیں
منظورِ بندگی مری ہو تجھ کو گو نہیں	وله	میں دست کش ہوں تجھ سے یہ ہوتا ہی سو نہیں
لی جب خواب سے اُٹھ آنکھ تو نے صحنِ گلشن میں	وله	شگفتہ ہو گئیں گلزار میں نرگس کی سب کلیاں
کیوں کیا جھاڑ کے نوبت غبار دامن	وله	کچھ نہ اتنا تھا میاں وہ ترا بار دامن
نہ لی آخر خبر اس نیم بسمل کی کبھو تو نے	وله	تجھے صد آفریں صیاد یوں ہی صید کرتے ہیں
جن کو دولت سے شہادت کی تمنا مخلص	وله	تیغ بیداد کو وہ بال ہما کہتے ہیں
گرم جوشی ستی مخلص سے ملے ہے جب یار	وله	رشک سے اُس کے رقیبوں کے جگر جلتے ہیں
ستم سے ترے آشنا کم رہے ہیں	وله	ہمیں ہیں کہ اب تک کہ یہاں تھم رہے ہیں

کہتے تو ہو ملنے کی آتی ہیں ہمیں گھاتیں | وله | جھوٹے ہو میاں تم تو کہنے کی ہیں یہ باتیں

روتے روتے جو کبھی ہوش میں آجاتا ہوں | وله | شرم سے اپنے ہیں جیسے کہ مُوا جاتا ہوں

اُس کے یہ ظلم و ستم کچھ نہ کہے جاتے ہیں | وله | نہ ہمیں چھوڑے بنے سہے نہ سہی جاتے ہیں

کہتا ہے تو جو ہر دم شمشیر سے ہے اور میں ہوں | وله | یہ طشت ہے، اور سر ہی تقصیر ہی اور میں ہوں

مخلص ترے کے یار بہت ہیں گے مشتری | وله | تم بھی اگر ہو اُس کے خریدار کچھ کہو

آئینہ رو کے دل میں کوئی راہ کیا کرے | وله | دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کرے

عاشق سوائے رونے کے اور کام کیا کرے | وله | جس کا جلا ہو دل سو وہ آرام کیا کرے

قاصد کو دیکھ دور سے دیتا ہے گالیاں | وله | ایسی پری کو پھر کوئی پیغام کیا کرے

مرے دل میں آتنا بسا آکے تو ہے | وله | کہ مجھ کو پڑی اپنی اب جستجو ہے

ڈرتا ہوں محبت مری اظہار نہ ہووے | وله | مجھ سے کہیں آزردہ وہ دلدار نہ ہووے

دل کو مرے ہرگز کبھی آرام نہ ہووے | آغوش میں میرے جو دل آرام نہ ہووے

یہ مشت خاک اُڑ جاتی ہی جب ملنے کو مجنوں سے | وله | بگولے آگے آتے ہیں اُسے لینے کو ہاموں سے

کیوں کہ ہووے گی زندگی اب آہ | وله | دل کی نوبت تو جان پر آئی

نہیں یک دل سلامت اس میں پایا | وله | شکن اُس زلف کی کیا دل شکن ہے

چمن میں قد نے ترے طرح جلوہ جب ڈالی | وله | نہال و گل نے کہا مدظلہ العالی

ڈرتے ہو دامن آہ کے شعلہ سے جل نہ جائے | وله | عاشق کی خاک پر نہیں آتے میاں کبھی

کوئی اپنے اسیروں سے تغافل یوں بھی کرتا ہے | وله | قفس میں مر گئے ہم یہ خبر صیاد کو پہنچے

سحر روتے لہو اور کرتے شام آہِ رسا گذری | وله | کبھی تو نے نہ پوچھا آہ اُس مخلص پہ کیا گذری

مخلص سا وفادار کوئی ہم نے نہ دیکھا | وله | اس طور کا بندہ نہیں ہوتا ہے خدا دے

رہتا ہے غضب مجھ پہ تو ہر شام و پگاہ | رباعی | کرتا ہے تو ثابت مری گردن پہ گناہ

تمہید نہیں اتنی بھی ظالم درکار | مطلوب اگر سر ہے مرا بسم اللہ

ناصح میں عجب دیکھی مروت تیری	رباعی	عاشق کے ستانے میں ہے رغبت تیری	
دل غم سے نہیں بھرا ہے اتنا میرا		جو اس میں سماوے یہ نصیحت تیری	

۵-مجذوب

مجذوب تخلص، میر غلام حیدر نام۔ شاہ جہان آبادی۔ بیٹا سرتاج شعراے بلند مقام میرزا رفیع سودا شاعر شیریں کلام کا ہے۔ آشنا پرستی اور یک رنگی کے ساتھ موصوف، دردِ دل اور گداز طبیعت میں مشہور و معروف۔ نظم ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، اور حسن ترکیب میں ناظمِ رنگیں بیان۔ تلاش سے معنی تازہ کے حتی الامکان نہیں گذرتے ہیں، اور باندھنے سے مضامین مشہور کے حتی المقدور کنارہ کرتے ہیں دو دیوان جواب میں میر تقی میر کے انہوں نے کہے، اور مقدور بھر سرانجامِ جواب سے غافل نہیں رہے غرض بالفعل، کہ سنہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ساتھ عسرت معاش کے لکھنو میں جیتے ہیں مصرع لختِ دل کھاتے ہیں اور خونِ جگر پیتے ہیں + یہ منتخب افکار اس ستودہ اطوار کا ہے +

خوباں سے جو دل ملا کرے گا		دھڑکا ہے یہی کہ کیا کرے گا
عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں	ولہ	بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں
نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی		تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں
آوے ہے مسیحا مری بالیں پہ تو کیا ہو	ولہ	بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو
اشک آنکھ میں ہو عشق سے تا دل میں غم رہے	ولہ	یہ گھر ہے وہ خراب کہ آتش میں نم رہے
چھوٹے اگر قفس سے تو خاموش ہم صفیر		صیاد نے سنا یہ ترانا تو ہم رہے

۶-مصحفی

مصحفی تخلص، غلام ہمدانی نام، ساکن امروہے کا۔ اپنی قوم کا اشراف ہے، سچ تو یہ ہے کہ گفتگو اس کی بہت صاف صاف ہے، بندش نظم میں اس کے ایک صفائی اور شیرینی ہے، اور معنی

بندش میں اس کے بلندی اور رنگینی۔ ایک مدت شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد سلطنت میں مقیم شاہ جہان آباد کا رہا ہے۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ایک چودہ برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے ضیقِ معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیبِ اہلِ کمال ہے، اسی طور پر درہم برہم اُس غریب کا بھی احوال ہے۔ دیوان اس عزیز کا بھرا ہوا نظم کے جمیع اقسام سے ہے۔ یہ اس کے منتخب کلام سے ہے۔

پیری میں اور بھی ہوئے غافل ہزار حیف — بے اختیار لے گئی ہم کو یہ خواب صبح

ولہ
ہوئی ہے بسکہ یہ فصلِ بہار دامن گیر — چلیں چمن سے تو ہوتا ہے خار دامنگیر
سمجھ کے رکھیو قدم دل جلوں کی تربت پر — مبادا ہو کوئی تیرا شرار دامنگیر

ولہ
آگیا خط پہ سرِ مو نہ گیا ناز ہنوز — ہے اسی ڈھب پہ نگاہِ غلط انداز ہنوز

ولہ
ایک دن رو کو نکالی تھی وہاں کلفتِ دل — اب تلک دامن صحرا ہے غبار آلودہ

ولہ
زبس آئینہ رو ہے طفل حجام — نہیں بن دیکھے اُس کے دل کو آرام

ولہ
جو دیکھیں انگلیاں وہ گوری گوری — بنا خورشید پانی کی کٹوری
وہ جس کے روبرو ناگاہ آیا — اُسے حیرت نے آئینہ دکھایا
ملا جب آئینہ کو ایسا نائی — بنائی چار ابرو کی صفائی
نہ کھینچے نامۂ مو اُس کی تمثال — کہ وہ ہے عاشقوں کی ناک کا بال
سنے ہی مصحفی اب تو بھی فی الحال — منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

۷۔ محبّت

محبّت تخلص، نواب محبت خاں نام۔ خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ہیں حسب ونسب کی طرف سے کثرت شہرت کے باعث نہیں محتاج بیان کے ہیں۔ جوان خوش ظاہر وخوش رو ہیں، اور خوش اختلاط وخوش خو حُسنِ خلق سے معمور، اور مروت وجوانمردی کے ساتھ

مشہور۔ فقط خوش مزاجی خلقی کے باعث اِنہوں نے شیوہ سخنوری کا اختیار کیا، اور خوش استعدادی طبعی کے سبب طبع بیگانہ خو کے تئیں لطافت معنی سے یار کیا۔ جمیع اقسام نظم میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے، اور اصلاح سخن کی میرزا جعفر علی حسرت تخلص سے لی ہے معاصرین اپنے میں مشہور ہیں ساتھ خوش بیانی کے، اور روشن طبیعتوں میں شہرت رکھتے ہیں ساتھ روشن زبانی کے۔ قصہ کسی بنّو کا فرمانے سے ممتاز الدولہ مستر جانسین بہادر کے انہوں نے نظم کیا ہے، اور نام اس مثنوی کا اسرارِ محبت رکھا ہے۔ بعد نواب حافظ رحمت خاں کی شکست کے، جو لکھنؤ میں آئے، تو اُسی ایام سے بس طور بود و باش کی وہیں ٹھہرائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت اعزاز و اکرام کیا تھا، اور مشاہرہ بھی معقول کر دیا تھا۔ بالفعل، کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، اُسی شہر میں بود و باش رکھتے ہیں، اور مضامینِ تازہ کی ہمیشہ تلاش رکھتے ہیں۔ دیوان میں ان کے نظم کے سب اقسام ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب کلام ہیں +

جب تلک وہ بُت خودکام نہیں آنے کا — دلِ بیتاب کو آرام کو نہیں آنے کا
مجھ کو خطرہ ہے خدایا نہ کرے جو اُس کا — دیوے تھا قاصد کہیں پیغام نہیں آنے کا
کیا خوشی کیجے یا رو کہ وہ خورشید لقا — صبح آوے گا تو پھر شام نہیں آنے کا

ولہ

کوئی ڈھب بھی تجھے آتا ہے وفاداری کا — یا کہ سیکھا ہے یہی شیوہ ستم گاری کا
دیکھا اک جھڑکی ہیں ای یار کوئی بھی ٹھہرا — کیا ہی اغیار کو دعویٰ تھا تری یاری کا

ولہ

قید ہو بیٹھے ہوا دونوں جہاں سے آزاد — میں تو بندہ ہوں محبت کی گرفتاری کا

ولہ

دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ ای صبا ٹک — میر اغبار کیجو برباد اس طرح کا

ولہ

مذکور جو محفل میں ہوا مہوش کسی کا — سنتے ہی ٹھکانا نہ رہا ہوش کسی کا

ولہ

شب کہ مجلس بیچ وہ غارت گر ہر خانہ تھا — تھے جو باہم آشنا ایک ایک سی بیگانہ تھا

ولہ

جس گھڑی بگڑ کر مرے تو جلوہ فرمانے لگا — غنچۂ تصویر بھی خجلت سے مرجھانے لگا
یہ بڑھا دیوانہ پن اپنا کہ ناصح دل ہوا — تھا مرا ہمدرد لیکن مجھ کو سمجھانے لگا

عاشقوں میں جب مجھے لکھا تو نے
تیری گلی سے دل افگار جو گیا سو گیا
تو اُس کے گھر کو تو ہنستا ہوا چلا اے دل
دل جو جاتا ہے چلا جائے کہیں مجھ کو کیا
چشمِ حیراں سے کہاں دل کو ملے لذتِ دید
منزلِ اوّل ہے ابھی عشق کی اے تاب و تواں
دل دیں گے رونمائی دستور ہے ہمارا
اللہ رے تکبر سنتا نہیں سخن بھی
جاتے ہیں جلد پھینکے توسن کو عمر کے ہم
غیر کو یاد تو زنہار نہ رکھ اے پیارے
دیدِ زمانہ کرتے ہیں ہم چشم خانہ میں
دل خشک ہے کہاں سے بہیں اشک چشم سے
نزع میں دم ترے پاس آنے کا ہم رکھتے ہیں
آپ کچھ غیروں کو چھپ چھپ کے رقم کرتی ہیں
سرخیِ اشک کبھی اور کبھی زردیٔ رو
بیٹھنے دیوے نہ وہ بزم میں اپنی جو مجھے
ساقی گھٹا ہمیں جو برستی نظر پڑی
بوسے کی بھی عوض نہ خریدی یہ جنس ہائے
یا تھا فلک پر اُس کا دماغ اب ہے خاک پہ
تمنّا یار سے ہیہات کہنے میں نہیں آتی

ولہ آج چہرا مرا بحال ہوا
ولہ عدم کے کوچہ سے اے یار جو گیا سو گیا
یہ ہے وہ قہقہ دیوار جو گیا سو گیا
ولہ اُس کی رسوائی کو کہتا ہوں نہیں مجھ کو کیا
مری آنکھیں جو تجھے دیکھ رہیں مجھ کو کیا
چھوڑ جاتے ہو تم افسوس نہیں مجھ کو کیا
ولہ کیا کیجئے یہی کچھ مقدور ہے ہمارا
یہاں تک وہ بت عزیز و مغرور ہے ہمارا
کیا کیجئے محبت گھر دور ہے ہمارا
ولہ بھول جا مجھ کو بھی لیکن یہ مری بات نہ بھول
ولہ اُڑتا ہے اپنا مرغِ نگہ آشیانے میں
فوّارہ تب چھٹے جو ہو پانی خزانے میں
ولہ دم میں دم جب تلک اپنے ہے یہ دم رکھتے ہیں
یہ جو جھوٹ ہووے تو ہم ہات قلم کرتے ہیں
ولہ تو نے اے عشق عجب رنگ دکھایا مجھ کو
ولہ تو اُٹھا لیجیو اے بار خدایا مجھ کو
ولہ یاد آئی ہے وہیں وہیں مستی نظر پڑی
اُس کو متاعِ دل مری سستی نظر پڑی
دل کی عجب بلندی و پستی نظر پڑی
ولہ غرض یہ کیا کہوں کچھ بات کہنے میں نہیں آتی

مخمس

کون سے روز میں سر سنگ سے مارا نہ کیا
ہجر میں تیرے میں کب جیب کو پارا نہ کیا
پر مرض کا مرے تو نے کبھی چارا نہ کیا
درد دل سے تو میں کس رات پکارا نہ کیا
نہ کیا میری طرف تو نے گذارا نہ کیا

یوں ہی آ نکلے تھے محفل میں تمہارے ہم تو
آپ کچھ دیکھ چکے سب یہ اشارے ہم تو
مر گئے ہائے اسی رشک کے مارے ہم تو
آ لگے گور کے اس غم سے کنارے ہم تو
تو بھی غیروں سے میاں تم نے کنارا نہ کیا

ولہ

ساری شب رہتی ہی مجھ میں اور دلبر میں خوشی
گر کہے سے میں جام بھر بھر دوں ہوں وہ مجھ کو کبھی
لیک حرف ناز اُس کا سُن نہیں رہ جی میں جی
چھیڑتا ہوں جب میں اُس کو تب یہ کہتا ہی ابھی
پاس سی ہم تیرے ان باتوں سی اب اُٹھ جائنگے

مثنوی

کہی القصہ پھر بندے سے یہ بات
اگر ضائع نہ ہووے اس میں اوقات
تو مضموں کر کے اس قصہ کا معلوم
یہ ہی منشور کر تو اس کو منظوم
یہ بات اسنے لئے تجھ سے کہی ہی
کہ مشق اس کی بہت تجھ کو رہی ہے
تجھے اس عشق کے ہیں کار معلوم
محبت کے ہیں سب اسرار معلوم
پیا ہے تو نے بھی جام محبت
سراپا تو ہے ہم نام محبت
ترے اشعار سن کر سب سخنداں
محبت کا اُسے کہتے ہیں دیواں
سراپا کیا لکھوں اُس شمع رو کا
کہ تھی وہ حُسن کا شعلہ سراپا
عیاں یوں ہوئے تھے عنبر آلود
کہ جیسے شمع کے شعلہ پہ ہو دود

دوپٹا چاند تاری کا زری باف — جو اوڑھے تھی کرانی بیبیاں صاف
سما ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر — شبِ دیجور میں چمکے ہیں اختر
گندھی چوٹی نظر اس شکل آوے — کہ جوں مارِ سیہ لہریں دکھاوے
بہت سے تھا دلوں کا اُس میں مسکن — اچنبا ہے کہ اک سانپ اور کئی من
نگہ بدرِ فلک کی اُس جبیں پر — اک ابرِ سیہ جیسے ہو مُنہ پر
وہ دندان آبدار اُس سیم بر کے — کہ سوراخ اُن سے ہیں دل میں گُہر کے
کروں کیا خوبیِ لب کی میں تقریر — قیامت اُس پہ تھی مسّی کی تحریر
تبسم میں نظر اس رنگ وہ آئے — کہ غنچہ جیسے نافرماں کا کھل جائے
زباں کھولوں اگر وصفِ دہاں پر — سخن ہو جائے گم میری زباں تک
کوئے کیا کیا جھکاوے عشق اُس آہ — جیسے چاہِ زنخ کی اُس کے ہو چاہ
نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی — وہ ہے گویا صراحی دار ہوتی
حنا سے سرخ تھا یوں پنجۂ ماہ — کہ جوں خوش خط لکھیں سُرخی سے اللہ
بھلا دوں کس سے نسبت ان کچوں کو — جو میداں حُسن کے سے دے گئی گو
عیاں وہ گلشنِ خوبی میں ہیں یوں — کہ جیسے دو انار اک شاخ میں ہوں
اگر دیکھے اُنھیں نامرد ذاتی — عجب کیا وہ بھی اپنی کوٹے چھاتی
جو وصف اُس ساق سیمیں کا سنے ہی — بہ حسرت شمع رو رو سر دُھنے ہے
قدِ موزوں وہ جب اپنا دکھا جائے — اور اُس کے فندق پا تک نظر آئے
تو حیرت سے ہوں یہ سب کو پر دیکھے — بنِ شمشاد میں غنچے نہ دیکھے
جھنک خلخال کی تھی کیا قیامت — کہ ہر سو جس سے برپا تھی قیامت
جو ہو ٹک فرشِ گل پر گرم رفتار — رگِ گُل پشتِ پا سے ہو نمودار

۸۔ منّت

منّت تخلص، میر قمر الدین نام۔ شاہ جہان آبادی۔ سلسلہ ان کے نسب کا ماں کی طرف سے سید جلال بخاری کو پہنچتا ہے۔ وہ سید جلال جنیبیٹے تھے سید عضد یزدی کے جن کا احوال مفصل تذکرہ کاشی میں لکھا ہے۔ قرابتوں کی تقریب اور پیوندوں کے سبب سے تربیت منت مذکور نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے گھرانے میں پائی ہے، اور کیفیت راہ طریقت و معرفت کی فخر العارفین مولوی فخر الدین قدس سرہٗ کی خدمت سے اٹھائی ہے۔ عقدے فن شعر و شاعری کے میر شمس الدین فقیر تخلص کی فیض صحبت سے ان پر کھلے، اور میر نور الدین نوید تخلص کی برکت مجالست سے دقیقے سستی و چستی نظم کے طے ہوئے۔ صفائی بندش و حسنِ بیان میں فی الحقیقت اُستاد، اور موشگافی معنی میں قلم اس کا رشکِ خامۂ بہزاد۔ زبان فارسی میں کلکِ عنبر سلک نے ان کے بہت کچھ لکھا ہے۔ نظم و نثر ملا کے قریب لاکھ بیت کے کلیات ان کا ہے۔ مثنویاں متعدد انہوں نے کہیں، اور کتابیں بیشتر تالیف کیں۔ چنانچہ شکرستاں کرکے ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے، اور جواب اگر گلستاں کا کہیں تو کیا مقدور ہے۔ سنہ ۱۱۹۱ گیارہ سو اکانوے ہجری میں ویرانی شاہ جہان آباد کے باعث لکھنؤ میں ان کا آنا ہوا، اور میر محمد حسین فرنگی لقب کی بار فروشی کی سبب مشتاق ان کا وہاں ایک زمانہ ہوا۔ بعد چندے مربی گری سے میر مذکور کے ممتاز الدولہ مسٹر جانسین بہادر کی سرکار میں توسل انہوں نے حاصل کیا، اور رفاقت میں صاحب مذکور کی کلکتے آکر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہسٹن جلاوت جنگ بہادر کی اعانت کے باعث پیشگاہ نظامت سے صوبہ بنگ کے خطاب ملک الشعرا کا لیا۔ بعد ایک مدت کے رفیق یہ مہاراجہ ٹکیٹ رائے کے ہوئے، اور چند ایام زندگی کے اپنے طور پر بسر کئے۔ سنہ ۱۲۰۶ بارہ سو چھ ہجری میں نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خاں بہادر اور مہاراجہ ٹکیٹ رائے واسطے کچھ سوال و جواب معاملات کے لکھنؤ سے کلکتے جو تشریف لائے، تو میر قمر الدین منت بھی ساتھ آئے۔ ایک تین چار روز تپ محرق ان کو عارض ہوئی، اور بغیر جان کے لئے وہ تپ نہ گئی۔ چنانچہ کلکتہ اس سید غریب الدیار کا مدفن ہوا۔

اور تارستخیز قیامت وہی مسکن ہوا۔ یہ خلاصہ افکار اُس منتخب روزگار کا ہے +

خشک نالے ہو گئے بہنے سے دریا تھم رہا / چشم میں اپنے نہیں اک عمر سے کچھ نم رہا

مے کدہ سے ٹل گئے اہلِ ہوس پی پی کر جام / انکھیں وہ ہوں کہ اس پیر مغاں میں جم رہا

کوتہ ہی اُس کی زلف سے دستِ صبا ہنوز / ولہ عقدہ ہوا یہ دل کا ہمارے نہ وا ہنوز

گُل نکلتے ہیں زمیں سیتی برنگِ شعلہ / ولہ کون دل سوختہ جلتا ہے تہ خاک ہنوز

گر نقش دوئی مٹائیں گے ہم / ولہ سچ کہیو کہ کیا کہائیں گے ہم

مصری سے وہ ہونٹ ٹک دکھاوے / کچھ گھول کے پی نہ جائیں گے ہم

اس آنے کا کچھ بھی لطف پیارے / ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم

آئینۂ دل جو تھا وہ ٹوٹا / کیا اب تمہیں منہ دکھائیں گے ہم

سو کوہِ آتشیں کو چھاتی سے پیلتے ہیں / ولہ کچھ عاشقی نہیں ہی ہم جی پہ کھیلتے ہیں

دل ہم ستم زدوں کا ہے واجب الترحم / اس نیم قطرہ خوں پر سو زخم جھیلتے ہیں

خوانِ کرم پہ تیرے سیر ایک عالم / ہم بے نصیب ابتک پاپڑ ہی بیلتے ہیں

منّت ایسے کو دل دیا تو نے / ولہ اے مری جان کیا کیا تو نے

مدعی اُس سے سخن سازیہ سالوسی ہے / ولہ پھر تمنّا کو یہاں مژدۂ پابوسی ہے

ہے مری طرح جگر خون ترا مدت سے / اے حنا کس کی تجھے خواہش پابوسی ہے

تہمتِ عشق عبث کرتے ہیں مجھ پر منّت / ہاں یہ سچ ملنے کی خوباں سے تو اک خوسی ہے

کوئی اس بدمزاجی پہ تمہارے پاس کیا بیٹھے / ولہ ادھر ٹک ہم نے دم مارا اُدھر تم منہ بنا بیٹھے

یہیں سے ہمرہانِ قافلہ اپنی تو رخصت ہے / کہ اس وادی میں ہم تو ضعف سے جوں نقشِ پا بیٹھے

کھڑے رہیئے جو اُس کی بزم میں تو یوں لگی کہنے / قطعہ دُکھاتا ہی یہ اپنے پاؤں کیوں ناحق کھڑا بیٹھے

جو اتنی بات سُن کر بیٹھ جاویں تو لگے کہنے / ہنسی سے کہتے ہی اک بات کیسے بس آپ آ بیٹھے

نہ آوے باز یہ بندہ تو منت بد کہانے سے / تکلف برطرف گر ساتھ اُس بت کے خدا بیٹھے

کہاں ہم کو غرض غم دل رو ہے	ولہ	گرہ زیر لب غنچۂ آرزو ہے		
قدم رکھ گیا کون سینہ پہ اپنے		گلِ داغ میں آج مہندی کی بو ہے		
سُنا تا تھا میں حال دل اُس کو منت		کہا چل بے یہاں سے یہ کیا گفتگو ہے		
آہو سے تیری چشم کی کب چھوڑیں یہ تشبیہ		جب تک کسی ساغر کو تو آنکھیں نہ دکھاوے		
اُٹھ جائے کسی کے جو دل صاف سے پروا		پھر آئینہ دنیا میں کبھو مُنہ نہ دکھاوے		
بندے کو خدا کے نہیں جز دل شکنی کام	ولہ	کیا سنگ ہے دل شیخ کا اللہ سے پاوے		
منت یک بار عشق سے توبہ کر	رباعی	چار و ناچار عشق سے توبہ کر		
اب تک مرووِ دین و دنیا رہنا		آجانے دے یار عشق سے توبہ کر		
منت جوں شمع دل جلا جاتا ہے	دیگر	روکا کب غم کا ولولا جاتا ہے		
کیا جانئے کیا خلش ہی سینہ میں آج		ہر سانس کے ساتھ جی چلا جاتا ہے		
منت ای جان ان بتوں کو مت پوچھ	دیگر	مت کھوا ایمان ان بتوں کو مت پوچھ		
ان باتوں پہ پتھر پڑیں تیری ظالم		اللہ کو مان ان بتوں کو مت پوچھ		

بابُ النون

۱-ناجی

ناجی تخلص، نام اس کا محمد شاکر تھا۔ شاہ جہان آبادی۔ شاہ نجم الدین آبرو تخلص کا معاصر تھا محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے وقت میں اس نے شہرت پائی ہے، اور بطور قدما کے طرز ایہام میں کرتا طبع آزمائی ہے۔ خوش طبعی اور ظرافت سے بیشتر سروکار رکھتا تھا، اور عالم کی ہجو کرنا شعار رکھتا تھا۔ شیوۂ قدیم میں صاحب دیوان ہے، اور وضع سابق میں شاعر خوش بیان ہے۔ لیکن ازبسکہ غیر مروج طرز ایہام ہے، کلام ان کا نامقبول طبائع خاص و عام ہے۔ یہ منتخب اوراق اُس کہنہ مشاق کا ہے۔

قوس قزح سے چرچا کرتا ہے تجھ بھوان کا	شاید کہ سر پھرا ہے اب پھر کر آسمان کا

نہ پوچھو خود بخود عارض خورشید کی خوبی	وله	لیا ہے داد حُسن ماہ مہ رویوں سی گر چندہ
مجھ کو باتوں میں لگا معلوم نیں کیا کیا گیا	وله	لے چلا جی کے تئیں منہ دیکھتا میں رہ گیا
تری نگاہ کی کثرت سے اے کماں ابرو	وله	ہمارے سینہ میں تودا ہوا ہے تیروں کا
مت گرآ زادو دام زلف سے دل	وله	بال باندھا غلام ہے تیرا
سخن سُن اُس بت کافر ادا کا	وله	حیا ہوگا کوئی بندہ خدا کا
رنگ تبرا گندمی دیکھ اور بدن مخمل سا صاف	وله	ہوش کھو کر آدمی بھولے ہیں اپنی خورد و خواب
دی ہے دریا اوپر مجھے مچھی	وله	لا اُتارا ہے میں اُسے کس گھات
محبّت سوں علیؓ کی دیکھ ناجی	وله	ہوا ہے دل مراب حیدر آباد
یکبار جو بغل میں لوں اُس سرو قد کے تئیں	وله	بالا بتاؤں خضر کی عمر ابد کے تئیں
عاشق کو روتے دیکھ چڑھا مت بھواں کے تئیں	وله	برسات میں اُتار رکھے ہی کماں کے تئیں
زلف کیوں کھولتے ہو دن کو صنم	وله	مُکھ دکھایا ہے تو مت رات کرو
ہی غرض ملنے میں نہ اُلفت کچھ اس بے درد کو	وله	پوچھتا ہے کانِ زر عاشق کے رنگِ زرد کو
غم نہیں گر دلبری سی دل کو لے جاتا ہے وہ	وله	پاس میرے تب تو آتا ہی جو دل پاتا ہی وہ
ان بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہی	وله	یہ تو طالب زر کے ہیں اور یہاں خدا کا نام ہے
وظیفہ راگنی کے سُر میں زاہد کفر ہے مت پڑھ	وله	نہیں تسبیح تیرے ہاتھ میں یہ راگ مالا ہی
ہوا جب آئینہ میں جلوہ گر میں تب لیا بوسا	وله	جو آیا اپنے قابو میں تو پھر منہ دیکھنا کیا ہی
انا الحق بولنے لگتا ہی اُس کے زخم کا بسمل	وله	کٹاری آبدار اُس شوخ کی منصور خانی ہی
اُس کے رُخسار دیکھ جیتا ہوں	وله	عارضی میری زندگانی ہے
تصور سی ترے رُخ کے گئی ہی نیند آنکھوں سے	وله	مقابل جس کے ہو خورشید کیونکر اُس کو خواب آئے

٢- نعیم

نعیم تخلص، نعیم اللہ نام۔ یہ توطن شاہ جہان آباد کا معاصر محمد حاتم حاتمؔ تخلص کا تھا۔ چنانچہ اکثر مشاعروں میں گفتگوئیں طنز و ایما کی ان کے درمیان آئی ہیں، اور مکرر غزلیں انہوں نے باہم لڑائی ہیں۔ ایک دن محمد حاتم نے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی، اور مطلع میں غزل کے طنز محمد نعیم پر کی ؎

جس دن سے کوئے یار کا حاتم مقیم ہے	بدتر اسے خزاں سے بہار نعیم ہے

جب دورہ پڑھنے کا محمد نعیم تک پہنچا تو انہوں نے بھی مطلع غزل یہ پڑھا ؎

طلب نہ ہو تو سلیماں کی کچھ بھی خاتم ہے	لب سوال نہ ہووے تو ہیچ حاتم ہے

غرض نعیم مذکور نے مرتے دم تک دلی نہ چھوڑی، اور شاہ جہان آباد ہی میں سیر جنت النعیم کی کی۔ ایک دیوان مختصر زبانِ ریختہ میں اُس کہن اُستاد سے ہے۔ یہ اُس کے طبع زاد سے ہے ✤

اس وقت تک اے یارو گفتار نہ کیجیے گا		اُس فتنۂ عالم کو بیدار نہ کیجیے گا
احوال سرِ اُس کے کہنے لگا وہ ظالم		اب جائیے بس زیادہ تکرار نہ کیجیے گا
خیال کرکے ترے موکمر کو روتا ہوں	وله	وہ کیوں نہ رووے پڑی جسکے بال آنکھوں میں
دیکھ آئینہ خانے میں گر تجھ کو نہیں باور	وله	تجھ سے تو جہان بیں بھی دلدار بہت ہوں گے

بَابُ الواو

١- ولی

ولی تخلص، شاہ ولی اللہ نام، دکھنی۔ وطن بزرگوں کا اس کے گجرات ہے۔ شاعر بلند مقام تھا۔ اول زبان ہندی میں دیوان اس عزیز نے جمع کیا ہے۔ اور نظم ریختہ کو سرزمین دکھن میں رواج اس نے دیا ہے۔ شعراء دکن میں مشہور و ممتاز ہے، اور اپنے معاصروں میں سربلند اور سرفراز۔ عالمگیر بادشاہ کی سلطنت میں ہندوستان کی طرف آیا، اور میاں گلشن کے فیض خدمت سے فائدہ انواع

واقسام کا اُٹھایا۔ خوب خوب داد تلاش معنی کی دی، آخر اس بیتِ بے معنی وجود سے راہ کاشانۂ عدم کی لی۔ یہ اشعار اُس سربلند افکار کے ثبتِ جریدۂ روزگار ہیں ٭

پھر میری خبر لینے کو صیاد نہ آیا
شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا

ولہ
بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں
کام ہے تجھ چہرۂ گل نار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

ولہ
گذر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا
ہوا دھاوا مٹھائی پر مگس کا

ولہ
صحن گلشن میں جب خرام کیا
سروِ آزاد کو غلام کیا

ولہ
پھرتے ہیں یہ مست ہو شمشیر نظر لے
بن بند اُن انکھوں کو پکڑ کون سکے گا
ہے نقش کناری کا ترے جامہ اوپر
دامن کو ترے ہاتھ لگا کون سکے گا

ولہ
جب تجھ عرق کے وصف میں جاری قلم ہوا
عالم میں اُس کا نانوِ جواہر رقم ہوا
نقطہ پہ تیرے خال کے باندھا ہے جس نے دل
وہ دائرے میں عشق کے ثابت قدم ہوا

ولہ
خدا نے منہ پہ ترے بابِ حسن باز کیا
قدِ بلند کو تیرے تمام ناز کیا

ولہ
تخت جس بے خانماں کا دشت ویرانی ہوا
سر اوپر اُس کے بگولا تاجِ سلطانی ہوا

ولہ
حُسن تھا پردۂ تجرید میں سب سے آزاد
طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ
حاکمِ وقت ہے تجھ گھر میں رقیب بدخو
دیو مختار ہوا ملکِ سلیمان میں آ
بسکہ مجھ حال سوں ہمسر ہے پریشانی میں
زرد کہتی ہے مرا زلف ترے کان میں آ

ولہ
شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا
ہر زباں پر ہے مثل شانہ مدام
ذکر تجھ زلف کی درازی کا

ولہ
دلِ صد پارہ تجھ پلک سوں بندھا
خرقہ دوزی سے ہے کام سوزن کا

ولہ
آیا ہے نقل لینے ترے منہ کی تاب کی
تار خطوط سیتی بنا مسطر آفتاب کی

ولہ
بجا ہے گر شہیدِ سرو قد کو
بنا دیں چوب سے طوبےٰ کی تابوت

نکلا ہے بے حجاب ہو بازار کی طرف	ولہ	ہر بوالہوس کی گرم ہوئی ہے دکان آج
گیا ہے دفع مرے دردِ سر کو رونے نے	ولہ	ہوا ہے حق میں مرے خون دیدہ صندلِ سُرخ
رحم بے جا ستم برابر ہے	ولہ	تو رقیباں اوپر کرم مت کر
جو آیا مست ساقی جام لے کر	ولہ	گیا یکبارگی آرام لے کر
میں اُس کو جوں نگیں کرتا ہوں سجدہ		جو کوئی آتا ہے تیرا نام لے کر
میں نہ جانا تھا کہ تو نادان ہے	ولہ	دل دیا تھا تجھ کو دانا بُوجھ کر
ہوں گرچہ خاکسار و لے از رہِ ادب	ولہ	دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز
لبِ دلبر پہ جلوہ گر ہے خال	ولہ	حوض کوثر پہ جوں کھڑا ہو بلال
صنم کے لعلِ لب وقتِ تکلّم	ولہ	رگِ یاقوت ہے موجِ تبسّم
نہ جا آنکھوں میں۔ آ بچھ دل میں اے شوخ	ولہ	کہ ہے خلوت میں اُس کی خوف یکدم
ٹک ولی کو صنم گلے سے لگا	ولہ	تجھ کو ہے بندہ پروری کی قسم
اُس کی دہنِ تنگ کی تعریف کو میں نے	ولہ	صنعت سے ولی دیدۂ عنقا پہ لکھا ہوں
خوبیِ اعجازِ حسنِ یار گر انشا کروں	ولہ	بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں
کیا کہوں تجھ قد کی خوبی سروِ عریاں کے حضور		خود بخود رسوا ہے اُس کو اور کیا رسوا کروں
سر کروں جب وصف تیرے جامۂ گل رنگ کا		جامہ زیبوں کو بہ رنگِ جامۂ دیبا کروں
رات کو آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب		زیورِ لب ذکر سُبحَانَ الَّذِی اَسریٰ کروں
آرزو دل میں یہی ہے وقت مرنے کی ولی		سروِ قد کو دیکھ سیرِ عالمِ بالا کروں
یک بار اگر بات مری گوش کرے تو	ولہ	ملنے کو رقیبوں کے فراموش کرے تو
غیرت سے کرے چاکِ گریباں دلِ پُرخوں		گر گل کی حمائل کو ہم آغوش کرے تو
اے جانِ ولی وعدۂ دیدار کو اپنے		ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو
ایسے نصیب میرے کہاں ہیں ولی کہ آج	ولہ	اُس گل بدن کو اپنے گلے ہار کر رکھوں

خوش قداں دل کو بند کرتے ہیں	وله	نام اپنا بلند کرتے ہیں
ای سامری تو دیکھ مری ساحری کے تئیں	وله	شیشہ میں دل کو بند کیا ہوں پری کے تئیں
صحبت غیر میں جایا نہ کرو	وله	درد مندوں کو کڑھایا نہ کرو
اک دل نہیں آرزو سے خالی	وله	بر جا ہے محال اگر خلا ہے
کیونکہ کپڑے رنگوں میں تجھ غم سے	وله	عاشقی میں لباس ہوتا ہے
رہیں گے خاک ہو تیری گلی میں	وله	وفاداری ہماری اس قدر ہے
دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن	وله	باعثِ خمیازۂ آغوش ہے
اب خلاصی عشق سے ممکن نہیں		دامِ دل زلفِ دو دامی پوش ہے
نشہ بخش عاشقاں وہ ساقیِ گلفام ہے	وله	جس کی آنکھوں کا تصور بیخودی کا جام ہے
مفلسی سب بہار کھوتی ہے	وله	عشق کا اعتبار کھوتی ہے
ترا منہ مشرقِ حسن انوری جلوہ جمالی ہے	وله	لبیں جامی جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے
مت تصور کرو مجھ دل کو کہ ہرجائی ہے	وله	چمن حسنِ پریرو کا تماشائی ہے
گل رخاں کیوں نہ کہیں تجھ کو سکندر طالع		جلوہ گر بر میں ترے جامۂ دارائی ہے
شیخ مت گھر سوں نکل آج تو خوباں کے حضور		گول دستار ترا باعثِ رسوائی ہے
اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق		کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے
دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے	وله	زخمی ہو شکار کیونکہ جاوے
چھوڑ اے شوخ طرزِ خودکامی	وله	مت ہو ہر دیدہ باز کا دامی
جب تک نہ ملے شرابِ دیدار	وله	آنکھوں کا خمار کیونکہ جاوے
تجھ لب و زلف کے تماشے کو	وله	چل۔ کہ آئے ہیں مصری و شامی

۲- ولی

ولی تخلص، میرزا محمد ولی نام۔ متوطن شاہ جہان آباد کے بھتیجے ہیں شاہ اسرار اللہ صاحب ارشاد کے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے احوال اُس خجستہ کردار کا کہ "جوانِ آزادِ حال اور دوست ہے اس خاکسار کا۔ سنہ ۱۱۹۴ گیارہ سو چورانوے ہجری میں بلدۂ مرشد آباد کے اندر جائے قرار رکھتے تھے، اور بیشتر شغل اشعار، زبان ریختہ میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہے، اور دیوان بھی ان کا منتظم ہوا ہے۔" یہ منتخب افکار اُس ستودۂ اطوار کا ہے +

نشۂ مے سے مرا پژمردہ دل گلشن ہوا		یہ چراغِ مردہ فیضِ آب سے روشن ہوا
دل تجھے منظور رہو اُس کا اگر دیکھنا	ولہ	جان سے دھو ہاتھ کو تب تو ادھر دیکھنا
زلف کو ہے کھولتا اپنے وہ منہ پر ولی		ملتی ہے آپس میں اب شام و سحر دیکھنا
آہ کا اُس کو کچھ اثر نہ ہوا	ولہ	میرے اس نخل میں ثمر نہ ہوا
بے کسی پر مری کہے کوئی	ولہ	تجھ بن اے نالہ نوحہ گر نہ ہوا
صحبتِ نیکاں کرے دل میں بدوں کے اثر	ولہ	قند کب شیریں کرے ہوئے اگر بادام تلخ
کیا تمنا اُس شکر لب سے تو رکھتا ہے ولی		ہو گیا فرہاد کا شیریں سے آخر کام تلخ
تھی آشنا نہ تیغ سے اُس کی کمر ہنوز	ولہ	ہم تب سے ہاتھ پر لئے پھرتے ہیں سر ہنوز
آنکھیں بھی انتظار میں پتھرا گئیں ولی		قاصد پر اُس صنم کی نہ لایا خبر ہنوز
میری زبان تر سے نہ ہو تازہ کام خشک	ولہ	کب سیر آب تیغ سے ہووے نیام خشک
کبھی جو زلف اُٹھاوے تو منہ نظر آوے	ولہ	اسی اُمید میں گذری ہے صبح و شام ہمیں
زندگی کی اُس نے کچھ لذت ولی جانی نہیں	ولہ	جس کے دل میں دردِ عشقِ دلبر جانی نہیں
چاہے کیونکر کہ یہ جی تن سے نکل جانے کو	ولہ	پھر نہ آیا جو گیا اُس کی خبر لانے کو
عیاں گر کروں دل کے سوزِ نہاں کو	ولہ	لگے آگ جوں شمع میری زبان کو

کبھی درد کی چاشنی کو نہ بھولے		ہما کھاوے میرے اگر استخواں کو
حد سے زیاد رشتۂ الفت ہے مختصر	وله	ایسا نہ ہو کہ اس میں پڑے اب جدا گرہ
ہجر کی مارے ہی ڈالے ہے شبِ تار مجھے	وله	کب دکھاوے گا خدا صبحِ رخِ یار مجھے
دانۂ خال دکھا کر کیا تو نے صیاد		زلف کے دام میں آخر کو گرفتار مجھے
جس جگہ عشق رخش تاختہ ہے	وله	وہاں رستم حواس باختہ ہے
نگہِ گرم سے پری رو کے		شیشۂ دل مرا گداختہ ہے
جو اس لعل میگوں سے مدہوش ہووے	وله	اسے ہر دو عالم فراموش ہووے
بندِ قبا چمن میں جو وہ یار وا کرے	وله	لے برگ گل کو ہاتھ میں پنکھا صبا کرے

باب الہاء

۱- ہدایت

ہدایت تخلص۔ شیخ ہدایت نام اس مرد کا ہے۔ شاہ جہان آبادی۔ معتقد اور شاگرد خواجہ میر درد کا ہے۔ ایک مثنوی انہوں نے بنارس کی تعریف میں بہت خوب لکھی ہے۔ اور داد مضمون تراشی کی دی ہے۔ شاعر فصیح بیان ہے، اور ناظم شیریں زبان۔ دیوان مختصر زبان ریختہ میں طبع زاد سے اس کے ہے، اور گم شدگانِ راہ معنی کو بیشتر ہدایت اس کہن استاد سے ہے۔ یہ منتخب کلام اس شاعر بلند مقام کا ہے +

جب لوں ہوں ترا نام ٹپک پڑتا ہے آنسو		جس طرح کہ سمرن کا ڈھلک جاتا ہے منکا
جسے کہ زلف سیہ نے تری ڈسا ہوگا	وله	غرض وہ مر ہی گیا ہوگا کیا جیا ہوگا
جوں غنچہ ترے وصف میں ہوں سر بہ گریباں	وله	ہے منہ میں زباں پر نہیں مقدور سخن کا
نہ رحم اس کے ہے جی میں نہ دل میں اپنے صبر	وله	ہماری گذرے گی کیونکر الٰہی کیا ہوگا
ہو گیا ہوں میں زرد جوں خورشید	وله	ظاہرا وقت ہے اخیر مرا
تمام صبر و دل و دیں تو یار لوٹ گیا	وله	نہ خلفِ وعدہ کیا پر ترا نہ جھوٹ گیا

بلا ہی زور ہے اس دخترِ رز کا ای ساقی
خمار جس کا مرے ہاتھ پاؤں کوٹ گیا

ملا ہے جا کے یہ آخر کو سادہ رویوں سے
اگرچہ آئینہ تھا دل پہ ہم سے چھوٹ گیا

ہے آدمی کو بھی قیدِ حیات اک زنداں
کسی نے خوب کہا ہے موا سو چھوٹ گیا

ولہ
آتش سے داغِ دل کی سراپا میں جل گیا
گلزار ہووے کیا کہ بدن سارا پھل گیا

رووے ہے کیا جوانی پہ اپنی کہ بے خبر
شب کیا گذر گئی ہے کہ اب دن بھی ڈھل گیا

لب پر ہزار حرفِ شکایت کا تھا ہجوم
مکھڑے کو دیکھتے ہی پہ کچھ دل بہل گیا

ولہ
ہر لختِ دل گلے کا مرے ہار ہو گیا
گل تھا پر اپنی چشم میں یہ خار ہو گیا

ہے کس کے جی میں خواہشِ سیرِ چمن یہاں
سینہ تمام داغوں سے گلزار ہو گیا

آیا ہوں تنگ کشمکشِ دامِ زلف میں
یارو میں کس بلا میں گرفتار ہو گیا

بوسہ طلب کیا تھا فقط اور کچھ نہیں
میں اتنی بات کہتے گنہگار ہو گیا

کچھ ان دنوں ہے حال ہدایت ترا تباہ
کیوں میری جان کیا تجھے آزار ہو گیا

ولہ
عالم کو تیری چشم نے بیہوش کر دیا
جس کی طرف نظر گئی مدہوش کر دیا

جاتا رہا ہوں آپ بھی میں اپنی یاد سے
کیا جانیئے کہ کس نے فراموش کر دیا

مجلس میں اُس کی رات ہدایت نے سوزِ دل
یہاں تک کہا کہ شمع کو خاموش کر دیا!

ولہ
نے جم رہا جہاں میں نہ یہ جام رہ گیا
مردوں کا اس جگہ میں مگر نام رہ گیا

کوئی پھرا نہ ملکِ عدم سے تو اب تلک
پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا

دیکھا جو تیرے چشم و دہن کو تو شرم سے
منہ اپنا لے کے پستہ و بادام رہ گیا

آتی ہے آج تجھ سے تو کچھ اور بو نسیم
رات اس چمن میں کون گل اندام رہ گیا

کیا دن تھے وہ بھی آہ ہدایت کہ جن دنوں
راتوں کو اپنے پاس وہ گل فام رہ گیا

مدت ہوئی ہے اب تو ملاقات بھی نہیں
آنے سے بلکہ نامہ و پیغام رہ گیا

ولہ
اک دن بھی مہربان نہ وہ بے وفا ہوا
اے آہ و نالۂ سحری تم کو کیا ہوا

ہر ایک دانۂ انگور یہاں شراب ہوا	وله	ولے یہ آبلہ اپنا نہ کامیاب ہوا
نہ صحنِ باغ میں لگتا ہے جی نہ صحرا میں		ہوا ہوں آہ میں یارب کس انجمن سے جدا
دیکھ اُس کی چشمِ مست کو دل تو بہک گیا	وله	بس میری جان وہ ہی پیالوں میں چھک گیا
دیکھا نہیں ہے ہم نے ہدایت کو ان دنو		شاید کسی جگہ پہ دل اُس کا اٹک گیا
عشق میں خوباں کے ہے طرزِ ستمگاری بہت	وله	آہ دلداری ہے کم یہاں اور آزاری بہت
مار ڈالا ہند کے کافر اداؤں نے ہمیں		حُسن میں ان کے نمک اور طرح داری ہے بہت
نہ ملے کارِرواں سے ہم اسے واے	وله	گرچہ کتنا جرس پکار رہا
یار ہے ہم میں ہدایت جلوہ گر	وله	جس طرح ہو گوہرِ یکتا میں آب
پر نہیں معلوم ہرگز آپ کو		آب میں دریا ہے یا دریا میں آب
تیری زلفوں کی کچھ چلی تھی بات	وله	روتے روتے ہی گذری ساری رات
دل تو سمجھائے سمجھتا ہے کبھو	وله	پر ہدایت چشمِ تر کا کیا علاج
کٹتی ہی نہیں یہ ہجر کی شب	وله	یارب کیا آج سو گئی صبح
تو نے گر قتل کیا ہم کو صنم خوب کیا	وله	ہاں میاں سچ ہے کہ ایسے ہی گنہگار تھے ہم
قیس وہ دن مر گیا فرہاد کی وہ شکل ہوئی		آہ اس کوہ و بیاباں میں کئی یار تھے ہم
تم نہ فریاد کسی کی نہ فغاں سنتے ہو	وله	اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو جہاں سنتے ہو
عصا لے ہاتھ آئی سُن تجھے گلشن میں آئی ہے	وله	یہ نرگس باوجود اس کے کہ ہے معذور آنکھوں سے
چولی مسک رہی ہے اور آنکھیں ہیں رسی	وله	سچ کہیو ہم سے رات پیاری کہاں رہے
کرتا نہیں ہے جانے کو دل کوئے یار سے		گو اس میں جی رہے نہ رہے ہم تو یہاں رہے
کیا خاک کو مری کہیں گلشن میں جا نہ تھی	وله	پر چشم تجھ سے ہائے مجھے یہ صبا نہ تھی
سیرِ چمن ہوا و مے و صحبت وطن		ایسی گئی کہ ہم سے گویا آشنا نہ تھی
گلشن وہ دوستی کے ہیں دیکھا چمن چمن		جز بوئے خونِ دل کہیں بوئے وفا نہ تھی

ضعف سے بیٹھا میں جوں نقشِ قدم تو کیا ہوا	وله	گرد باد آسا مری طینت میں ہے آوارگی
ہووے تب صد عیش و عشرت ہم کو تیرا دید ہے	وله	مل گئے جس دن گلے تیرے اُسی دن عید ہے
دل مرا کیوں کر ہو غافل گور سے	وله	گھر نظر آتا ہے اپنا دور سے
آنکھ سے آنسو کبھو تھمتا نہیں		چشم بھی کیا کم ہے یہ ناسور سے
دل نہ کر تو شکوۂ جورِ بتاں		فائدہ کیا یار اس مذکور سے
گر سنت یہی جور اور جفا ہے	وله	بندے کا بھی اے بتاں خدا ہے
غرض یہی ہے مجھے اشک کے بہانے سے		کہ مہرباں ہو وہ یارب کسی بہانے سے
برنگِ اشک اُسے آبرو ہے دنیا میں		جو اپنے گھر میں ہی محفوظ آب و دانے سے
وہ کیا کرے کہ محبت کا اقتضا ہے یہی		وگرنہ فائدہ اُس کو مرے ستانے سے
کہیں جو مہر و وفا ہو جہاں میں یا اخلاص		الٰہی اُٹھ گئی یہ رسم کیا زمانے سے
میں چھوڑتا ہوں کوئی اُس کو مثلِ حلقۂ در		یہ سر لگا ہے مرا اُس کے آستانے سے
انکھوں نے تری جس کے تئیں مست کیا ہے	وله	وہ شورِ قیامت ستی ہشیار نہ ہووے
آتا ہے مجھے رحم ترے حال پہ زاہد		اے وائے اُس اوپر کہ جو مے خوار نہ ہووے
کیا کہوں تجھ سے ہدایت کہ مری شام و سحر	وله	یاد میں زلف و رخِ یار کے کیونکر گذری
دن گذرتا ہے مجھے روزِ قیامت سے دراز		رات گذری تو شبِ مرگ سے بدتر گذری
پختہ مغزانِ جنوں سے ہر کسی کو جنگ ہے	وله	جو ثمر پکا سو پامالِ جفائے سنگ ہے
عشق نے تیری مجھے یاں تک کیا ہے ناتواں		تا بہ لب آنا نفس کو راہ صد فرسنگ ہے
ان دنوں کچھ تو ہدایت ہو گیا ہے زرد سا		ظاہرا عاشق کسی پر ہے ترا کیا رنگ ہے
صدقے ترے گلعذار جی سے	وله	اک جی سے ہیں کیا ہزار جی سے
کھٹکے ہے تری مژہ ہر اک وقت		نکلا نہ کبھو یہ خار جی سے
گھر سے نکلے ہے تو جی ساتھ نکل جاتا ہے	وله	کوئی آفت ہے کہ یہ آہ دلِ محزوں ہے

زلفِ کج منہ اوپر جو چھوڑی ہے	وله	کیا یہ صید ہے نکلتا تھوڑی ہے
چشمۂ خوں سے ہے دامنِ دریا		آستیں کس نے یاں نچوڑی ہے
شاخِ گُل خم نہیں کسو نے کیا		ہاتھ معشوق کے مڑوڑی ہے
عمر کوتاہ کارِ عمر دراز ؟		سانگ ہے، بہت رات تھوڑی ہے
ایک وہ ماہ رو غائب ہے نظر سے ورنہ	وله	وہی تارے ہیں وہی ماہ وہی گردوں ہے
یہ خوب سیر کی جگ میں ہر ایک بستی کی	وله	بنا خراب ہو بنیاد بت پرستی کی
ہمیں نشیبِ فرازِ زمانہ سے کیا کام		جو سر بلند ہیں اُن کو ہی فکر پستی کی
جی تو گلشن میں بھی نہیں لگتا	وله	کس کی مجلس سے ہم اُداس گئے
جب سُنا میں نے غم ہدایت کا		سُنتے ہی بس مرے حواس گئے
جاؤں گل میں وُشت میں یا شہر میں پھروں		کوئی ایسی شکل ہو دے کہ ٹک جی بہل سکے
شہیدِ تیغِ ابرو ہی اسیرِ دامِ گیسو ہے	وله	ہدایت بھی تو کوئی زور ہو شہد اشکستہ ہے
ثابت کوئی اُپنے جسم و جاں سی نہ پھرا	رباعی	یک شخص ہزار کشتگاں سے نہ پھرا
کوچہ تو ترا رہِ عدم سے نہیں کم		جو کوئی گیا سو پھر وہاں سے نہ پھرا
دلِ جہد شباب ہو چکا ہے باقی	رباعی	پیری ہے سو اس میں کیا رہا ہی باقی
ہوتا ہے کوئی دم میں یہ دور اب آخر		شب گذری ہے روز رہ گیا ہی باقی

بابُ الیاء

ا یقین

یقین تخلص، انعام اللہ خاں نام۔ شاہ جہان آبادی۔ بیٹا اظہر الدین خاں، اور نواسا شیخ مجدد الف ثانی کا تھا۔ شاگرد میرزا مظہر جان جاناں کا۔ مشہور اور منظورِ نظر مرزاے مذکور۔ اکثر یہ گمان باشندگان شاہ جہان آباد تھا، کہ یقین فنِ شعر و شاعری میں محض بے استعداد تھا۔ مرزا مظہر خود شعر کہتے تھے، اور نام اس کا داخل اشعار

کرتے تھے۔ مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں بہ سبب کسی حرکت نامعقول کے، کہ وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے، باپ نے اس کے اس کو قتل کیا، اور نعش کی اس کو دریا میں بہا دیا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اُس عملِ شنیع کا گذرا تھا۔ اس کے باپ کے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں۔ یقین نے اس مقدمہ میں باپ کو اکثر متنبہ کیا۔ ایک دن اُس نے خفا ہو کر اس بیچارے کا جی ہی لیا۔ علم غیب کا بدرستی خدا کو ہے، اور یقین گمانوں کا بالکنہ اس خالق ارض و سما کو ہے۔ بہر حال یقین مذکور کا کلام طبائع کے مرغوب ہے، اور اشعار اس کے جاں خراش و دل کوب۔ یہ ابیات آبدار اُس کا خلاصہ افکار ہیں +

نہ مرتا میں اگر صدقے ترے جانے کی کام آتا
گر سنہ ناز کا تھا گالیاں کھانے کے کام آتا

ولہ
میں تو ظاہر نہ کروں اُس کی جفا کو لیکن
چھپ سکے کیونکہ یقین زخم نمایاں میرا

ولہ
مجھے گر حق تعالیٰ کار فرمائے جہاں کرتا
بتوں کو میں بہ زورانِ بیکسوں پر مہرباں کرتا

نہ دیتا عیش کی خسرو کو فرصت قصر شیریں میں
جو میں ہوتا بجائے شیر جوئے خوں رواں کرتا

اگر مر کر نہ میں اُس شوخ کی خاطر نشاں ہوتا
خدا جانے وفا میرے کے حق میں کیا گماں کرتا

زباں فولاد کی ہو تب جوابِ کوہ کن دیوے
ستم ہوتا اگر پرویز کو عشق امتحاں کرتا

ولہ
نہیں معلوم اب کے سال میخانے پہ کیا گذرا
ہماری توبہ کرنے سیتی پیمانے پہ کیا گذرا

برہمن اپنے سر کو پیٹتا تھا دیر کے آگے
خدا جانے مری صورت سے بتخانہ پہ کیا گذرا

یقین کب میرے سوزِ دل کی داد کو پہنچو
کہاں ہے شمع کو پروا کہ پروانے پہ کیا گذرا

ولہ
ہیں زخم مرے کاری اس سینے سے کیا ہوگا
اب مرنا ہی بہتر ہے اس جینے سی کیا ہوگا

ولہ
اگر تجھ کو زلیخا دیکھتی سب کچھ بسر جاتی
تماشا ماہِ کنعانی کا اُس کو خواب ہو جاتا

ولہ
سر پہ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِ ہما سے سایہ دیوار بہتر تھا

مرا دل مر گیا جس دن سی نظارہ سی باز آیا
یقیں پرہیز اگر کرتا تو یہ بیمار بہتر تھا

ولہ
تنگ دل کو کب بھلی لگتی ہی بستاں کی ہوا
باغ سے یوسف کو رنگیں تر ہی زنداں کی ہوا

نہ آب تیشہ فرہاد اپنے خوں میں گر ملا سکتا — تو ایسے رنگ سے کب نقش شیریں کو بنا سکتا
یہ عشق سر شکن فرہاد پر لایا جو کچھ لایا — وگرنہ کون ایسی فتح خسرو کو دلا سکتا

وله
تجھ آنکھوں سے اُتر کر دل نہ کرتا شور کیا کرتا — یہ شیشہ طاق سے گرتا نہ ہوتا چور کیا کرتا

وله
یہ دل ایسا خرابِ کوچہ و بازار کیوں ہوتا — اگر ملتا نہ اتنا گل رخوں سے خوار کیوں ہوتا
تری اُلفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھو ورنہ — یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا
یقین اُمید جینے کی نہیں تیری ان آنکھوں سے — اگر پرہیز تو کرتا تو یوں بیمار کیوں ہوتا

وله
گرا ہیں آنکھ سے تیری جہاں کے ہاتھ کیا آیا — مجھے پٹکا زمین پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا
نہ کہتی راز دل تو اتنی رسوائی بھلا سہتی — فضیحت کر کے مجھ کو اس زباں کے ہاتھ کیا آیا

وله
کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کا بند — برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

وله
دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک — دیکھا سو اس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

وله
اس قدر غرق لہو میں یہ دلِ زار نہ تھا — جب حنا کو ترے پاؤں سے سروکار نہ تھا
حسن کا عشق زلیخا سیتی کچھ چل نہ سکا — ورنہ وہ پاک گہر قابلِ بازار نہ تھا
دل مرا عشق کے دھڑکوں سے مؤا جاتا ہے — یہ وہ دل ہے کہ کوئی ایسا جگر دار نہ تھا
دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس — کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

وله
اتنا کوئی جہاں میں کبھو بے وفا نہ تھا — ملنے میں تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا
ناصح جو یہ نصیحت بیجا ہے میں سُنی — معذور رکھیو مجھ کو مرا دل بجا نہ تھا

وله
خفیف مجھ سے اُلجھ کر عبث ہوا واعظ — کہ میں تو مست تھا اُس کو بھی کیا شعور نہ تھا

وله
تری آنکھوں کی کیفیت کو مے خانہ سے کیا نسبت — نگہ کی گردشوں کو دور پیمانے سے کیا نسبت

وله
بتاں کی مجھ سی خاطر جمع ہی یہاں تک کہ کہتے ہیں — کہاں اس دام سے یہ صید جا سکتا ہی کیا قدرت
ہمارا شور سُن مجنوں کو بھولی طرز نالے کی — کوئی شیروں کے منہ پر نے بجا سکتا ہی کیا قدرت

وله
شیشۂ دل کے تئیں اپنے سنبھالے رکھ یقیں — پھر کرے گا کون اُس کے پھوٹ جانے کا علاج

سو جگہ سے دل گریباں پھاڑ دیوانے کی طرح
جی نکل جاتا ہے میرا جب کبھو آتی ہے یاں
خار سے مژگاں کے جی ڈرتا ہے میرا بے طرح
فصلِ گل بھی آن پہنچی دیکھیے کیا ہو یقیں
گرچہ شیریں شیخ کے ہے وجد میں آنے کا شور
آہ و نالہ پر نہیں موقوف شہرت عشق کی
دل ہمیں کہہ کر چلا تھا اپنے جانے کی خبر
بلبلیں سہیم چلی جاتی ہیں باغوں کی طرف
نہیں پہنچتا ضعف سے نالہ مرا صیاد تک
توقع دے کے مت کہ نا امیدی کی سخن بس کر
جو لوہا جس نہ دی اُس کو لگانا ہاتھ کیا حاصل
خال گورے منہ کا لیتا ہے مرے دل کو چرا
گریباں پھاڑتے ہیں دیکھ خوبانِ چمن کیونکر
کوئی محنت کوئی لذت اُٹھاوے یار سے کوئی
تعجب سخت رہتا ہے یقیں اس بات کا مجھ کو
بعد مرنے کے ہوں میں گور میں غمناک ہنوز
منہ پہ کھاتا ہے اسی طرح سے تلوار کہ بس
نزع میں دیکھ مجھے یار جھجک کر بولا
آپ کو بیچ کے یوسف نے زلیخا کو لیا
آپ سے ہم نے مقرر کی ہے اپنی جا قفس
تنگ تو کرتا ہے پر ہم جو کہیں جاتے رہیں

ولہ زلف کی زنجیر میں آخر پھنسا شانے کی طرح
وہ قسم کھا کر اسی ساعت مکر جانے کی طرح
ولہ رکھ مری آنکھوں پہ دیتے ہو کفِ پا بے طرح
آگے چلتا ہے جنوں پر دل ہمارا بے طرح
ولہ پر قیامت بانگ ہوتا ہے مے خانہ کا شور
کس قدر ہے اس خموشی ساتھ پروانے کا شور
ولہ پھر نہ دی ہم کو کسی نے اُس دیوانے کی خبر
کچھ تو اُڑتی سی سنی ہے گل کے آنے کی خبر
کون لے اس ناتواں کی اب دوا دینے کی خبر
ولہ جواب تلخ مت دے مجھ کو اے شیریں دہن بس کر
بہت کی تو نے اس تیشہ کی خدمت کوہکن بس کر
اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پھرتے ہیں چور
ولہ نہ کیجے چاک ناصح اس ہوا میں پیرہن کیونکر
کھوا اپنے تئیں ضائع نہ کرتا کوہکن کیونکر
کہ اتنا بولتے ہیں تلخ یہ شیریں دہن کیونکر
ولہ گرد پھرتے ہیں مری خاک کے افلاک ہنوز
ولہ دل مرا عشق میں ایسا ہے جگر دار کہ بس
کیا بری طرح سے مرتا ہے یہ بیمار کہ بس
کیا خریدار یہ پایا ہے خریدار کہ بس
ولہ ورنہ ٹک پھڑکیں تو ہو جاوے نہ دوبالا قفس
توڑا منہ دیکھتا رہ جائے گا تنہا قفس

وله
آج دیکھی ہی میں وہ لطف کی بیداد کہ بس
سر پہ آیا مرے اس طور سے جلاد کہ بس

جی میں آتا ہے تری چھب کو کر دکھا دیجے اُسے
باغ میں اتنا اکڑتا ہے یہ شمشاد کہ بس

کچھ پر و بال میں طاقت نہ رہی جب چھوٹے
ہم ہوئے ایسے بُرے وقت میں آزاد کہ بس

تو نہ تھا حیف یقیں ورنہ دیوانہ ہوتا
آج اس طرح کا دیکھا ہے پریزاد کہ بس

وله
عاقبت تن پروری ہوتی ہے گردن کا وبال
کس قدر پہلوی چرب اپنی سے دکھ پاتی ہی شمع

اہلِ نور آہن دلوں کو دیکھ شرماتے ہیں سخت
دیکھ کر گل گیر کی صورت کو ڈر جاتی ہی شمع

وله
بہ نہیں ہوتا کسی مرہم سے اس سینہ کا داغ
ہو گیا ناسور آخر یارِ دیرینہ کا داغ

وله
ہم تو مرتے ہیں گے اور بجھتا ہی اُلفت کا چراغ
دیکھئے پھر ہووے کب روشن محبت کا چراغ

خاندانِ درد مجھ سے کیوں نہ ہو روشن یقین
ہے مرا ہر داغ سینہ میں مصیبت کا چراغ

وله
ناصح سے مجھ کو غم نے کیا شرمسار حیف
سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

دل نہیں کھنچتا ہی بن تیرے بیاباں کی طرف
خوش نہیں آتا نظر کرنا غزالاں کی طرف

اس ہوا میں رحم کر ساقی کہ بے جامِ شراب
دیکھ کر چھاتی بھری آتی ہے باراں کی طرف

سحر کے ڈورے جو سنتے تھے سو یہ دیکھے یقیں
دل کھنچا جاتا ہے اُس زلفِ پریشاں کی طرف

آئینہ ہوتا ہی اُس روئے درخشاں کا حریف
ماہ بن اور کون ہو خورشید تاباں کی طرف

وله
بہت جینے کی تدبیر اہلِ عرفاں کو نہیں لائق
کہ پینا آبِ حیواں شانِ انساں کو نہیں لائق

وله
رشک سے لاگے ہی پروانے کے جیسی تن کو آگ
لگیو ای فانوس ایسی تیرے پیراہن کو آگ

جلتے بتوں سے کل ان تتلیا کپڑوں کے ساتھ
جی دھڑکتا ہی مبادا لگ اُٹھے دامن کو آگ

وله
چمن میں مجھ سی دیوانی کو لیجانے کا کیا حاصل
دکھا کر گل جنوں کو شور پہ لانے کا کیا حاصل

جنہیں بالوں کی پھانسی دی ہی وہ ہرگز نہیں جیتے
جو زلفوں میں پھنسا دل اُس کے غم کھانے کا کیا حاصل

ہمارے درد کی دارو اگر کچھ ہی تو دارو ہے
یہ سب کچھ سُن کے ساقی بات پی جانے کا کیا حاصل

وله
ہم نہ کہتے تھے کہ مت چھیڑ ان دونوں دھاروں کے تئیں
خط کی صورت میں پڑا آخر نہ آہوں کا وبال

اس تغافل ساتھ میرے سامنے سے درگذر
ہاتھ لگتا گر زبانِ مصر کو یہ آفتاب
مے ہوئی آخر رہی تدبیر غم کی ناتمام
تیری آنکھوں میں نشہ نے اس طرح مارا ہی جوش
کروں کیونکر میں قید زلف سی چھٹنے کی تدبیریں
ہمیں بھی بات کہ آتی ہی لیکن دل نہیں حاضر
یقیں اقبال ہاتھ آیا نہیں کچھ جی کے جانے سی
چمن میں شاخ ہل جاتی ہی جیسے گل کے ہلنے سی
زخم بن مجھ کو کچھ اس لاگ سے مقصود نہیں
ہے اُسی تیغ کے زنگار کا مرہم درکار
کرتا ہی کوئی یار وِ اس وقت میں تدبیریں
ناداں ہی جو معنی چھوڑ صورت کی طرف جاوے
چہرے سی نکل کر سو لپٹے ہیں یقیں منہ پر
کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجھ کو بہاراں میں
چمن کی بیچ کلیانی ہے جیسے شاخ سنبل کی
بہار آئی ہی ہم کو کیا کہے گا باغباں دیکھیں
اُٹھا اس منہ سی ای بادِ صبا گھونگٹ کی آنچل کو
نہ کر خجل مجھے مہماں مرا نہ ہوا ے عشق
تو نے ہم پر جو جفا کی ہے سو ند کو نہیں
سینہ میرے میں تری عشق سی جو شان ہی عسل
دین و دنیا کی مجھے کام سے کھوتا ہے یقیں

بے طرح پڑتا ہی حسرت کی نگاہوں کا وبال
ولہ خواب ہو جاتا اُنہیں اُس ماہ کنعاں کا خیال
ولہ کس سے دل خالی کریں اب ہو چکا ملنا تمام
ولہ ڈالتے ہیں جس طرح بدست مے خانے میں دھوم
ولہ پڑیں ہیں میرے ہر انگشت میں جوں شانہ زنجیریں
حیا سے دور ہی ناصح خموشی ساتھ تقریریں
نہیں ہووے گی ہم فرہاد کو سو بار سر چیریں
ولہ لچک جاتا ہی دم لیتے نزاکت اس کو کہتے ہیں
ولہ عشق پھیکا ہی اگر داغِ نمک سود نہیں
اور کسی طرح مرے زخم کا بہبود نہیں
ولہ مرتا ہے یہ دیوانہ اب کھول دو زنجیریں
لڑکوں کو کتابوں سے منظور ہیں تصویریں
اوراق طلائی پر جوں کھینچی ہیں تحریریں
ولہ عبث سیتے ہو اُس کو کیا رہا ہی اب گریباں میں
ہوئی ہیں کس قدر دل جمع اُس زلف پریشاں میں
ولہ چمن میں باندھنے پاوینگے اب آشیاں دیکھیں
توجہ سی تری ہم بھی ٹک اک یہ گلستاں دیکھیں
ولہ کہ میری آنکھ میں آنسو جگر میں آہ نہیں
ولہ ستم پہ ہم نے جو وفا کی ہے سو منظور نہیں
کون ناسور ہے جو نیش کا معمور نہیں
چھوڑ دوں عشق نہ باللہ کہ مقدور نہیں

خدا کی بندگی کہئے اُسے یا عشق معشوقی
سو سو ہیں التفات تغافل میں یار کے
شیریں دہن بھی تلخ لگے بولنے یقیں
وہ کون دل ہی جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں
ترے سفر کی خبر سُن کے جان دھڑکوں سے
کوئی بھی دیتا ہے لڑکوں کے ہاتھ شیشۂ دل
جس محبت میں نہیں ہی شور ہی وہ بے نمک
بن یقیں کے باغ میں جا کر بتاں کہتے ہیں سب
شکوہ جفا کا یار سے کرنا وفا نہیں
اگر رستم ہو عاشق دم نہ مارے یار کے آگے
گالی بھی پی گئے ہیں ماریں بھی کھائیاں ہیں
ایسا دراز دامن میں ہاتھ اُن کے آیا
حق کو یقیں کے آخر برباد ست دو یارو
قامتِ رعنا سے تیرے بس کہ شرماتا ہی سرو
تم ہمیں پامال یوں کرنے تھو اب خوش قامتو
کھڑا ہے سرو بنٹ بن بنا کے رعنا ہو
نہ لاتا تھا مرے گریہ کو شور پرائے عشق
خونِ انصاف سے اتنا بھی زباں تر نہ کرو
باندھ کر مجھ پہ کمر لطف نہیں غیر کا قتل
کوئی یہ چاند سا مُنہ چھوڑ کر عاشق ہو شعلہ کا
ستاؤ مت یقیں کا دل کہ یہ خوباں کا مسکن ہی

وله وہ نسبت ایک سے سو سو طرح تعبیر کرتی ہیں
بیگانگی سے اُس کی کوئی آشنا نہیں
اب چھوڑ دے نظارہ کچھ اس میں مزا نہیں
وله اُس آفتاب کا کس ذرہ میں ظہور نہیں
جو پہنچوں مرنے کے نزدیک میں تو دور نہیں
یقیں میں غور سے دیکھا تو کچھ شعور نہیں
وله کیا مزا ہے عشق کرنے میں جو رسوائی نہیں
سیرِ گل سے جی نہیں لگتا وہ سودائی نہیں
وله بندہ کو اعتراض خدا پر روا نہیں
وله کہ اُس کا جی نکل جاتا ہی اُس کی ایک ہچکی میں
وله کیا کیا تری جفائیں ہم نے اُٹھائیاں ہیں
بختوں کی عاشقوں کے کیا نارسائیاں ہیں
تم نے سخن کی طرز میں اُس کی اُڑائیاں ہیں
وله دیکھ کر تجھ کو زمیں کے بیچ گڑ جاتا ہے سرو
دیکھتے ہو قمریوں کو سر پہ بٹھلاتا ہے سرو
وله جو یار پردے سے نکلے تو کیا تماشا ہو
بُری بلا تو نے چھیڑی ہے دیکھئے کیا ہو
وله لعل کو یار کے ہونٹوں سے برابر نہ کرو
اپنی بیداد کے مضموں کو مکرر نہ کرو
وله گذر آتش پرستی سے یہ پروانے سے کہہ دیجو
وله خدا جانے کہ کیا ہو اس کے مےخانے کو مت چھیڑو

ولہ
جفا کے عذر میں اے ظالمو نہ دیر کرو
مری زباں پہ شکایت پہ مت دلیر کرو

حنا کی طرح میں اپنا بہل کیا ہے خوں
بتاں شہید کرو خواہ دستگیر کرو

خدا کرے کہ کہوں حق شتاب ثابت ہو
مت امتحانِ وفا میں یقیں کے دیر کرو

ولہ
جو تو شراب پئے کیونکہ دل کباب نہ ہو
لگے جب آگ کہاں تک یہ زہرہ آب نہ ہو

خنک گذرتے ہیں ایام عشق داغ بغیر
کہ سرد ہووے ہوا جس دن آفتاب نہ ہو

دیوانے شہر سے یہاں آکے جی چھپاتے ہیں
خدا کرے یہ خرابہ کبھی خراب نہ ہو

بتاں کی طرح نہیں حسنِ خلق و دامنِ پاک
وہ کیا مزا ہے جو معشوق بدشراب نہ ہو

یقیں بتاں کا ہوا جب سے بندہ تب سے ہی داغ
جو ہووے کافر اسے کس طرح عذاب نہ ہو

ولہ
شہر میں تھا نہ ترے حسن کا سا شور کبھو
مصر اس جنس سے اتنا نہ تھا معمور کبھو

فکر مرہم کی مرے واسطے مت کر ناصح
خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کبھو

گو نہ کر وعدہ وفا دے مجھے اس کا تو جواب
مجھ سے ملنا بھی سجن ہے تجھے منظور کبھو

اپنی بیداد کی سوگند ہے تجھ کو اے مرگ
تو نے دیکھا ہے یقیں سا کوئی رنجور کبھو

ولہ
خواب میں کس طرح دیکھوں تجھ کو بیخوابی کی ساتھ
جمع آسایش کہاں ہوتی ہے بیگانے کی ساتھ

مفت نہیں لیتے وفا کو شہر خوباں میں یقیں
کس قدر بے قدر ہے یہ جنس نایابی کی ساتھ

ولہ
بہار آئی ہے میں کیا حکم ہے اے باغباں سچ کہہ
چمن میں رہنے پاوے گا ہمارا آشیاں سچ کہہ

نمک ڈالا ہے مجھ میں اے ہما شورِ محبت نے
کبھو کھائی ہیں تو نے اس مزی کی استخواں سچ کہہ

یقیں راتوں کو کر کر شور نیندیں سب کی کھوتا ہے
یہ کس سے ورد سیکھا ہے فریاد و فغاں سچ کہہ

ولہ
کچھ عمر نہیں باقی پیارے تو شتاب آجا
ڈرتا ہوں چھلک جاوے لبریز ہی پیمانہ

منہ اپنے کی گلشن میں رہنے نہ دیا گر تو
یہ سبزہ ترے خط کا ہے سبزۂ بیگانہ

روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے
کچھ خوب نہیں سنتا افسوں سے ہے یہ افسانہ

ولہ
عمر میں تو نے تو دیکھے ہیں بہت غم خانے
آ تو اے چرخ ٹک اک اس دلِ ناشاد کو دیکھ

وله
کہاں تاثیر نالوں میں ہے ای مرغ سحر چپ رہ
عبث صیاد کو ناخوش ہی کیوں کرتا بس چپ رہ

وله
جب ہوا معشوق عاشق دلربائی کیا کرے
بندگی سے جس نے خو کی ہو خدائی کیا کرے

وصل کی گرمی سے مجھ کو ضعف آتا ہے یقیں
دیکھئے مجھ ساتھ خوباں کی جدائی کیا کرے

وله
کیا دل ہی اگر جلوہ گہ یار نہ ہووے
ہے طور سے کیا کام جو دیدار نہ ہووے

دل جل جو گیا خوب ہوا سوختہ بہتر
وہ جنس کوئی جس کا خریدار نہ ہووے

وله
دوانے کس طرح ناصح اُٹھاویں ہاتھ طفلاں سے
کہ ہے کشتِ جنوں سیراب اُن کی سنگ باراں سے

وله
یار کب دل کی جراحت پہ نظر کرتا ہے
کون اُس کوچہ میں جز تیر گذر کرتا ہے

اپنی حیرانی کی ہم عرض کریں کس مُنہ سے
کب وہ آئینہ پہ مغرور نظر کرتا ہے

عمر فریاد میں برباد گئی کچھ نہ ہوا
نالہ مشہور غلط ہے کہ اثر کرتا ہے

وله
جو سر پاؤں پہ رکھ دیجے تو خوش ہوویں میاں ہم سے
ولیکن ہائے ہو سکتی ہے یہ جرأت کہاں ہم سے

وله
مرے آنسو بھی مارے ضعف کے اب چل نہیں سکتے
کیا اے عشق مجھ کو ہائے ایسا ناتواں تو نے

وله
خطا ہے مفت مر کر یار کیوں دیجے رقیباں کو
ہماری ہم سے پوچھو کوہکن کی کوہکن جانے

وله
اگر دیتے ہو دل کی داد جتنا اُس کا جی چاہے
تو کرنے دو اُسے فریاد جتنا اُس کا جی چاہے

نہیں ممکن کہ ہم کعبہ کو جاویں چھوڑ بت خانہ
کرے واعظ ہمیں ارشاد جتنا اُس کا جی چاہے

وله
نہیں کوئی کہ دشنام اُس کی ہم تک یا دعا لاوے
گیا ہے اب اُس کو دیکھئے کب تک خدا لاوے

پڑے پتھر الٰہی اس محبت پر کہ ہو بے کس
مرے فرہاد اور پرویز و شیریں کو اُٹھا لاوے

دیار حسن میں تو خوش ہوا پر یہ بڑی مشکل
کہ لُٹ جاتا ہے وہاں جو کارواں حُسن و وفا لاوے

مناسب ہیں ہی شکوہ جور کا ان خوب رویوں سے
یقیں کوئی بُری باتوں کو اچھے منہ پہ کیا لاوے

وله
زمیں پر جس طرح گرتا ہے سایہ سرو رعنا کا
تری قامت کے آگے فرش ہو جاتی ہے رعنائی

نہیں ہوتے کبھو احباب کی خاطر ملول اُس سے
خدا ناآشنا عجبے بد مصاحب ہے یہ تنہائی

وله
معاوضہ میں وفا کے جو یہ جفا ہووے
کبھو کسو سے کوئی کیونکہ آشنا ہووے

اگرچہ خیر ہمیں یاد کر نہیں سکتا
کبھو بُرا ہی ہمیں کہ ترا بھلا ہووے

یقیں ہوا مجھے قطرے سے اشک کے معلوم
نہ اُٹھ سکے کوئی جو آنکھ سے گرا ہووے

وله
خبر کیا پوچھے مرغِ قفس سے آشیانے کی
اسیروں کو توقع کب ہے پھر گلشن میں جانے کی

گئے پکڑے شروعِ گل میں اور پروازِ اوّل میں
نہ دی فرصت زمانے نے ہمیں دھومیں مچانے کی

ہوا جاتا ہوں مست اتنا بھی کس کر باندھ بالوں کو
ٹک اک ڈھیلی تو کر دے جان زنجیریں دِوانے کی

وله
زنجیر میں بالوں کے پھنس جانے کو کیا کہیے
کیا کیا کیا یہ دل نے دیوانے کو کیا کہیے

دل چھوڑ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا
اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہیے

وله
دکھ تو دیتا ہے کروں تجھ کو بھی حیراں تو سہی
باغباں اب کے اِجارے لوں گلستاں تو سہی

وله
مُفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے
جی ہی لے چھوڑے گی آخر کو یہ بیماری مجھے

کب ہوس ہی مجھ کو رسوائی کی لیکن کیا کروں
کھینچ کر لاتی ہے اس کوچہ میں ناچاری مجھے

کیا اگا لیتا ہے خوباں کو یقیں کرتی ہی داغ
آئینہ کی سادہ لوحی ساتھ پرکاری مجھے

وله
جس کو منظور ہو جینا اُسے مرنا ہی عذاب
ہے دمِ پاکِ مسیحا دمِ شمشیر مجھے

وله
بے قراری کب ٹھہرنے دے ہی مجھ کو زیرِ تیغ
مارنا سیماب کا مشکل ہے قاتل کیا کرے

وله
ستم ہی قید کرنا اِس طرح کے مرغِ ناداں کو
کہ جو مارے بھلائی کے قفس کو آشیاں سمجھے

وله
کرتے ہیں اپنے بال دکھا مبتلا مجھے
اس پیچ سے بتاں کے نکالے خدا مجھے

جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر
کرتے تو کی پہ راست نہ آئی وفا مجھے

وله
خدا مجھے ترے داغوں سے لالہ زار کرے
یہ خارِ خشک مگر آگ سے بہار کرے

قیامت آپ پر اُس قد سے لا چکے ہم تو
کہاں تلک کوئی محشر کا انتظار کرے

وله
اس بسنتی پوش سے آغوش رنگیں کیجیے
جی میں ہے اک مصرعِ موزوں کو تضمیں کیجیے

نگاہ گرم سے کھاؤ بھی تاب مو کی طرح
خدا کسی کے تئیں اتنا خوش کمر نہ کرے

وله
یہ دل مملوکِ خوباں کا کون اس کو چھپا رکھے
بغل میں کون مالِ بادشاہی کو دبا رکھے

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے	ولہ	میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے
دوستی بد بلا ہے اس میں خدا		کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے
ہے وہ مقتول کافر نعمت		اپنے قاتل کو جو دعا نہ کرے
ناصحوں کی یہ کچھ نصیحت ہے		کہ یقیں یار سے وفا نہ کرے
حسن اور عشق میں اک طور کی نسبت ہے ضرور	ولہ	چشم بیمار تجھے دی ہے دل زار مجھے
یار آیا پہ مجھے ہوش نہ تھا کیا کیجے		نہ کیا اس دل دشمن نے خبردار مجھے
چھٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے	ولہ	وصیت ہے ہماری خوں بہا جلاد کو پہنچے
نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے اب نالہ کرتا ہوں		مری فریاد بھی شاید مری فریاد کو پہنچے
ہمیں اس غم کے ہاتوں زندگانی خوش نہیں آتی		کوئی بیداد گر یارب ہماری داد کو پہنچے
ہوا میں سرو کی آتنا نہ کر شور و شر اے قمری	ولہ	نہ دے برباد تو اپنی کف خاکستر اے قمری
یقیں رکھیو کہ شوخی خوب نہیں خدمت میں خوباں کی		تو بیجا سرو کے چڑھ بیٹھے سر پر اے قمری
گئی سب بھول شکوے دیکھ روئے یار کیا کہئے	ولہ	زباں پر آ رہے میری ہوئے بیکار کیا کہئے
تبسم میں جو اس کا منہ کھلا جی بندہ گیا اپنا		مرا دل لے گیا ہنستے ہی ہنستے یار کیا کہئے
اگر اس کی جگہ پہلو میں ہونا چار بہتر تھا		بہت دیتا ہے میرا دل مجھے آزار کیا کہئے
یقیں کے واقعہ کی سن خبر وہ بدگماں بولا		یہ دیوانہ کچھ ایسا تو نہ تھا بیمار کیا کہئے
دوانہ ہوں میں جی دینے میں مجنوں کے سلیقہ کا	ولہ	تڑپ لے کے مرنے کی طرح فرہاد کیا جانے
گلا تو پھٹ گیا نے کیطرح فریاد کر نیسے		قیامت دور ہے کب تک ٹلے گی داد کیا جانے
نکل بھاگا ہو کوئی صید کیا اس دام سے بیچ کے		کئی دل ہیں کہ تیری زلف کی خاطر پریشانی
اگر زنجیر میری پاؤں میں ڈالے تو کیا ہوگا	ولہ	بہار آنے دو میرا ہاتھ ہو اور یہ گریباں ہے
یہ وہ آنسو ہیں جن سے دہر آتشناک ہو جاوے	ولہ	اگر بہ جائے کوئی یہ آب جل کر خاک ہو جاوے
گنہگاروں کو ہے امید اس اشک ندامت سے		کہ دامن شاید اس آب رواں سے پاک ہو جاوے

عجب کیا ہے تری خشکی کی شامت سے جو تو زاہد | کہاں تاک ٹیلا وے تو وہ مسواک ہو جاوے

ولہ
اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے | مزا بُرا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

یہ کون ڈھب ہے سجن خاک میں ملانے کا | کسو کا دل کبھو پاؤں تلے ملا بھی ہے

یقیں کا شور جنوں سُن کے یار نے پوچھا | کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

ولہ
خوش آئی ہے مجھے یہ بات اُس مجنونِ عریاں سے | کیا کیجے کہاں تک چاک گذری ہم گریباں سے

ولہ
نہیں ہے جامِ مے بن کچھ ہمارا خونبہا ساقی | اس آبِ زندگی سے اپنے یاروں کو جلا ساقی

ٹک اک تو رحم کر اے مرگ مے کی تمنا میں | ہماری جان کو روتی ہیں یہ ابر و ہوا ساقی

ولہ
وفا کا کیا قیامت ہے، کوئی بدلا جفا دیوے | ترحم اِن بتوں کو اپنے بندوں پر خدا دیوے

ولہ
نہیں پرواز قسمت میں میری اُڑا | خفا ہو زندگی سے مر گیا ہوں لیک ڈرتا ہوں

ولہ
مبادا حشر مجھ کو خوابِ راحت سے جگا دیوے | محبت کا جو ناتا ہے عجب آداب ہیں اُس کے

ولہ
کہ جوں جوں یار دیوے گالیاں عاشق دعا دیوے | نہ دے فرصت ان ہاتھوں سے کہ کچھ کام بھی نکلے

ولہ
ہم آخر ہوں گے دامنگیر اس چاکِ گریباں کے | رگڑتا ہے سر اپنا پشت پا پر منفعل تیرے

ولہ
گریباں پھاڑیئے اس پر کہ کیا طالع ہیں داماں کے | ٹک اک انصاف کر کرتا ہے اتنی بھی جفا کوئی

ولہ
کھوڑ صندل کھینچ ماتھے پر کیا ہے قتلِ عام | تیغ ابرو کو دیا ہے سنگ دیکھا چاہیے

۲۔ یکرنگ

یکرنگ تخلص، مصطفیٰ قلی خاں نام، متوطن شاہ جہان آباد کے۔ نواسوں میں خانجہان خاں لودی کے ہے، اور معاصر شاہ نجم الدین آبرو کے تھے۔ منصبداروں میں محمد شاہ بادشاہ، اور شہرۂ آفاق ساتھ عزت و جاہ کے، مشہور سخنوروں میں شاہجہاں آباد کے، اور معروف باں آوروں میں اس خجستہ بنیاد کے تھے۔ طور انکی گویائی کا پیرو قدما کی گفتگو کے ہے، اور طرز ان کے کلام کی روئیہ پر مضمون و آبرو کی ہے، لیکن از بسکہ شیوہ سابق یاران حال کے غیر مرغوب ہے، تو آہنگ قدیم سمع خراش و دماغ کوب ہے۔ بلدۂ شاہجہان آباد میں انہوں نے اس سرائے فانی سے سفر کیا اور دلوں پر احباب کے داغ حرماں کا دیا۔ یہ اشعار پر معنی و خوش بیان ان کے منتخب دیوان ہیں۔

مجھے مت بوجھ پیارے اپنا دشمن ولہ کوئی دشمن ہوا ہے اپنی جاں کا

میں روز و شب وصال سے تیرے ہوں کامیاب ولہ کیونکر کہوں کہ تجھ سی بہتر ہے آفتاب

سچ کہے جو کوئی تو مارا جائے ولہ راستے ہیں گے دار کی صورت

مجھ کو معلوم یوں ہوا گل سے ولہ بھول جاتے ہیں اُس سے دولتمند

کیوں سچے ہو تم کہو دشمن ہمارے اس قدر ولہ دوست کا دشمن کوئی ہوتا ہی پیارے اس قدر

نگہباں چاہیئے سرشار کے پاس ولہ تری آنکھوں سے کیونکر دل جدا ہو

رُو ٹھتا ہوں اس سبب ہر بار میں ولہ تا گلے تیرے لگوں اے یار میں

اُس پری پیکر کو مت انسان بُوجھ ولہ شک میں کیوں پڑتا ہی اے دل جان بُوجھ

کیا جانئے وصال ترا ہو کسے نصیب ولہ ہم تو ترے فراق میں ای یار مر چلے

رونقِ اسلام تیرے رو سے ہے ولہ کفر کا رشتہ ترے گیسو سے ہے

بے قراروں کے تئیں آرام دل اے مرے پیارے ترے پہلو سے ہے

جدائی سے تری اے صندلی رنگ ولہ مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے

ہوا معلوم یہ غنچہ سے ہم کو ولہ جو کوئی زردار ہے سو تنگ دل ہے

نہیں چھوڑیں ہیں سدا زلف تری اپنی مروڑ ولہ باوجودیکہ کمال ان میں پریشانی ہے

اب تو سجن ہمیں کو نباہی تمہیں سے ہے ولہ ہم سب طرف سوں یار تمہاری گلے پڑے

یکرنگ پاس اَور سجن کچھ نہیں بساط ولہ رکھتا ہے یہ دو نین کہو تو نظر کرے

زخمی برنگِ گل ہیں شہیدانِ کربلا ولہ گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا

کھانے چلا ہے زخمِ ستم شامیوں کے ہاتھ دھو ہاتھ زندگی سیتی مہمانِ کربلا

اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ ہے سر بریدہ شمع شبستانِ کربلا

بعون اللہ تعالیٰ کتاب تذکرۃ الشعرا من تالیف مرزا علی خاں لطف [illegible]

ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۳۵ ہجری روز جمعہ بعد سہ پاس روز گذشتہ بہ اتمام [illegible]